حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

امّتِ مسلمہ

رہبر اور مثالی امت
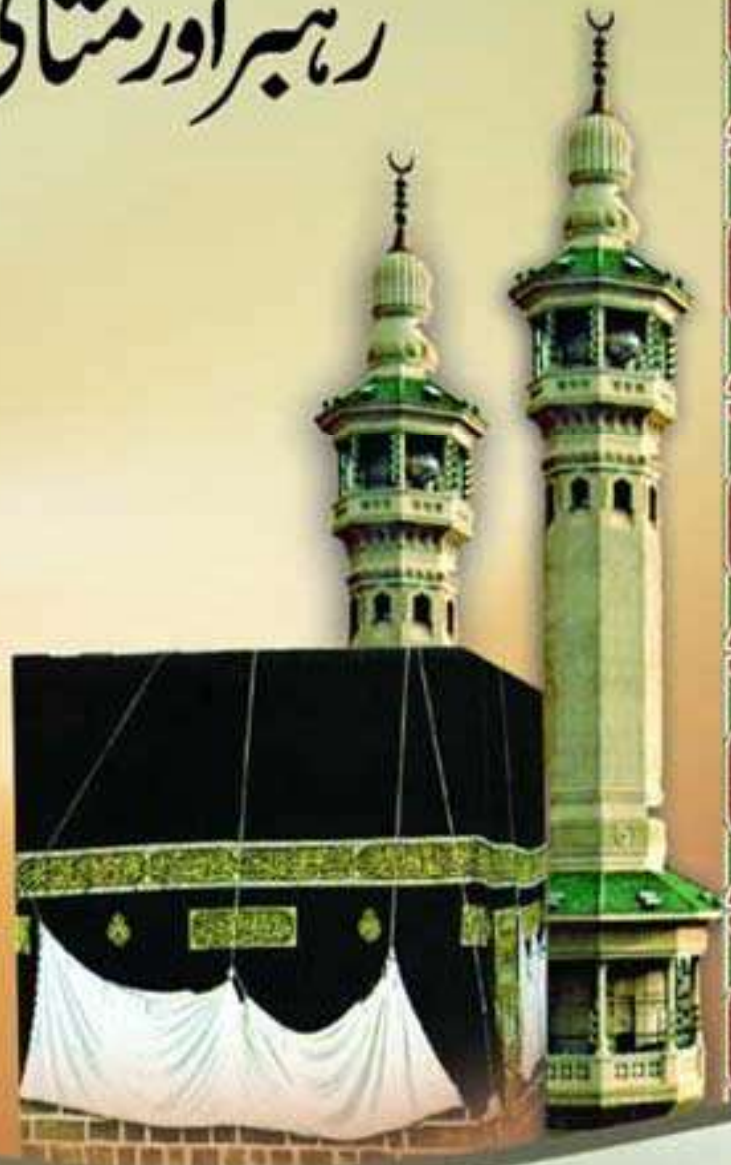
سید احمد شہید اکیڈمی
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

امت مسلمہ

رہبر اور مثالی امت

(ماضی اور حال کے آئینہ میں)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

سیّد احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

طبع اول (جدید)

رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ - اگست ۲۰۱۱ء

کتاب	:	امت مسلمہ - رہبر اور مثالی امت
مصنف	:	حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی
صفحات	:	۱۷۶
کمپوزنگ	:	حشمت علی
		(مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)
تعداد	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)

ملنے کے پتے :

☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی

☆ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ الجدیدۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

ناشر :

سیّد احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

فہرست

امت اسلامیہ کی عظمت اور اس کی امتیازی خصوصیات

(۶۷-۱۱۲)

مغربی فکر وثقافت اور اسلام

(۱۱۳-۱۲۶)

اسلامی معاشرہ کے امتیازی پہلو اور اس کو درپیش خطرات

(۱۴۶-۱۲۷)

معاشرہ کی موجودہ کمزوریاں اوران کا علاج (۱۴۷-۱۷۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

پیش نظر کتاب عم مخدوم و معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہم کی وہ تصنیف ہے جس کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی اہم ترین تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) کا امتداد کہا جا سکتا ہے، امت کے عروج وزوال کا دنیا پر کیا اثر پڑا، مسلمانوں کے دور عروج میں ان کو کیا ملا اور ان کے انحطاط سے دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی کہ آج ساری ظاہری ترقیات کے باوجود انسان کو سکون حاصل نہیں، وہ اپنے کو ایک جانور سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے، انسان کے اندر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا نہیں بلکہ جانور کا دل دھڑک رہا ہے، امت مسلمہ جب تک اپنی ذمہ داری پوری کرتی رہی، انسانیت کا کیسا فروغ ہوا، اور جب اس نے اپنا اصل مقام کھو دیا تو وہ کس طرح بے حیثیت ہو کر رہ گئی، دوبارہ اس کا کھویا مقام کیسے حاصل ہو سکتا ہے، اس کی تدابیر کیا ہیں، یہ وہ اہم ترین اور حساس موضوعات ہیں جن پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب دراصل ان بیش قیمت مقالات کا مجموعہ ہے جو حضرت مولانا مدظلہم نے عالمی سیمیناروں کے لیے ترتیب دیے تھے اور وہ کتابی شکل میں شائع کیے گئے، موضوع کے لحاظ سے یہ بہت مفید اور دعوت فکر و عمل دینے والے مقالات ہیں جو مسلمانوں کے دور زوال میں ان کو جھنجھوڑنے کا کام کرتے ہیں۔

اس سے پہلے اس کی اشاعت مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے ذریعہ عمل آئی تھی، اب اس کی اشاعت کا کام سید احمد شہیدؒ اکیڈمی کے سپرد ہوا ہے، اکیڈمی حضرت مولانا دامت برکاتہم کی شکر گزار ہے کہ مولانا نے اکیڈمی کو اس کی طباعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اس جدید طباعت میں چند چیزوں کا مزید لحاظ رکھا گیا ہے، جن مغربی مفکرین کے نام صرف اردو میں لکھے گئے تھے، ان کو انگریزی میں بھی لکھ دیا گیا ہے تاکہ ان کا صحیح تلفظ سامنے آسکے، اگر کہیں حوالوں کا اندراج رہ گیا تھا تو اس کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، راقم اس کے لیے خاص طور پر عزیز القدر مولوی محمد نفیس خاں ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار اور ان کے لیے دعا گو ہے کہ انھوں نے اس کے لیے بڑی محنت کی اور تصحیح ومقابلہ کا بھی کام کیا، ان کا تعاون کرنے والے عزیزان مولوی سید محمد مکی حسنی سلمہ اللہ اور مولوی ظفیر الاسلام سلمہ اللہ بھی شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے اور کتاب کے فائدہ کو عام فرمائے۔

۱۰/شعبان ۱۴۳۲ھ

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مقدمہ

——————— حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله صلى الله عليه وسلم أما بعد!

امت مسلمہ جو انبیاء علیہم السلام بالخصوص سید المرسلین وخاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کی حامل، ہر زمانہ میں عالم انسانی اور معاصر دنیا کی محتسب اور رہنما ہی نہیں بلکہ ایک ایسا انسانی عنصر ہے جس پر انسانیت کی فلاح واستقامت، سلامت روی، نہ صرف انسانی دوستی بلکہ نوع انسانی کی راست روی، خدا شناسی، حقیقت پسندی اور عمومی امن وامان کی بقاء کی بھی ذمہ داری ہے، اس کے بارے میں کتاب وسنت، سیرت نبویؐ اور دینی رہنماؤں و مصلحین کی تاریخ وسیر اور تعلیمات میں ہدایات وتعلیمات اور عملی نمونے منتشر اور عدد وشمار سے بھی بالاتر ہیں، ضرورت تھی کہ امت مسلمہ کے ایک رہبر ومثالی امت ہونے کے موضوع پر وہ مستند اور بیش قیمت مواد جمع کر دیا جائے، جو قدیم مآخذ کتاب وسنت اور اکابر امت کے حالات وتعلیمات میں منتشر ہے، اور ان گوشوں وشعبہائے زندگی کو سامنے لایا جائے، جن کے بارے میں اس امت پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے، اور وہ ان کے بارے میں خدا کے سامنے مسئول وجواب دہ اور واقعات ونتائج کی روشنی میں قابلِ تنقید واحتساب ہے جن کا تعلق اخلاق سے بھی ہے، معاشرہ سے بھی ہے، اور زندگی کے مختلف شعبوں سے بھی، اس کے ساتھ ساتھ تاریخی طور پر اس کا جائزہ بھی لیا جائے کہ مسلمانوں نے اس ذمہ داری کو کس حد تک ادا کیا اور اس کے انسانی زندگی اور معاشرہ پر کیا اثرات پڑے۔

یہ موضوع اہم اور نازک بھی تھا، اور اس کے لیے وسیع وعمیق مطالعہ کی، اور دین کے

اصل مآخذ ومراجع سے براہ راست واقفیت کی ضرورت بھی تھی، مقام مسرت ہے کہ فاضل عزیز مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے عربی میں ان عناوین اور موضوعات پر مضامین لکھے جن میں متعدد بین الاقوامی سیمیناروں میں پیش کیے گئے، اورعربی میں کتاب کی صورت میں شائع ہوئے، ان کا ترجمہ ندوۃ العلماء کے ترجمان ''تعمیر حیات'' میں شائع ہوتا رہا، اب وہ ایک مستقل کتاب کی شکل میں ناظرین کے سامنے پیش کیا جارہا ہے، جو اپنے اندر گراں قدر معلومات، وسیع وعمیق مطالعہ کے نتائج، خود عمل کرنے اور امت مسلمہ کی رہنمائی کا جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سعی مشکور، مصنف ومترجم کو ماجور اور قارئین کو اس سے فائدہ اٹھانے پر آمادہ بلکہ مجبور کردے وماذلك على الله بعزيز۔

ابوالحسن علی ندوی
۲۸/جمادی الثانی ۱۴۱۹ھ
۲۰/اکتوبر ۱۹۹۸ء

دیباچہ

از: مؤلف

مسلمان دنیا کی دوسری قوموں اور دوسرے اہل مذاہب سے الگ صرف ایک صاحب مذہب قوم ہی نہیں بلکہ ایک کامل اور ممتاز ملت ہیں، ان کو زندگی کی ایک مکمل تشکیل کرنے والا ضابطۂ حیات دیا گیا ہے اور ان کو زندگی کے دینی اور دنیاوی دونوں پہلوؤں کو اپنانے اور دونوں کے جو ضروری تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے، جس کو پورا کرنے نہ کرنے کے متعلق اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہونا ہے، ان پر خود اپنی زندگی کے تقاضوں کو مناسب اور صحیح طریقہ سے پورا کرنے کی اجازت کے ساتھ اپنے خالق ورازق حقیقی و پروردگار کو راضی رکھنے اور راضی کرنے کے طریقوں کو اپنانے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ ان کو اپنے ماں باپ، اپنے اعزہ اور اپنی اولاد کے حقوق کو بھی بطریق احسن ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ اپنے اہل محلّہ بلکہ اپنے اردگرد ساری مخلوق خدا کے حقوق ادا کرنے کی بھی ذمہ داری دی گئی ہے۔

ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں اپنے پروردگار کو خدائے واحد ماننے اور خالص اسی کی عبادت کرنے کے معاً بعد ماں باپ کے حقوق ادا کرنے کا حکم آیا ہے اور خاص طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ انہوں نے تمہاری پیدائش سے قبل سے لے کر پیدائش کے دوسال بعد تک تمہارے لیے بڑی زحمتیں اٹھائیں لہٰذا ان کا حق مانو اور پورا کرو۔

اہل خاندان کے سلسلہ میں صلہ رحمی کے لفظ سے ان کی فکر کرنے اور حقوق ادا

کرنے کی جگہ جگہ تاکید آئی ہے اور بہت اجر کا کام بتایا گیا ہے۔

پڑوسیوں کا حق ادا کرنا حق جوار کے نام سے تاکید کے ساتھ بتایا گیا ہے اور اس طرح بار بار تاکید کی گئی ہے کہ بعض صحابہ کو خیال ہونے لگا کہ ان کا حق شاید میراث میں بتادیا جائے۔

اور سارے انسانوں کے ساتھ حسن سلوک اور ادائے حق انسانی کی تاکید آئی ہے، اور اس پر بے انتہا اجر کا وعدہ کیا گیا ہے اور بدسلوکی پر خدا کی طرف سے سزا اور گرفت سے ڈرایا گیا ہے۔

اپنے پروردگار کو راضی کرنے اور راضی رکھنے کے لیے اس کی طرف سے بھیجے گئے احکام اور ضوابط حیات بتائے گئے ہیں اور حدیث شریف میں ان کی تفصیل آئی ہے۔ خدا کا یہ راضی رکھنا عقیدۂ توحید، اور خدا کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو اور آپ (ﷺ) کے ذریعہ خدا کے بھیجے ہوئے احکام کو ماننے اور اختیار کرنے پر مشتمل ہے کہ یہ عمل دل سے بھی ہو اور قول سے بھی ہو اور عمل سے بھی ہو۔

اس طرح مسلمان کو ایک کامل امت اور اس کے مذہب کو ایک جامع ضابطۂ زندگی بتایا گیا ہے، پھر اس کو صرف ایک کامل امت اور جامع طریقۂ زندگی کا حامل ہی نہیں بتایا گیا ہے بلکہ اس کو دوسری امتوں کا نگراں اور اس کو دیئے گئے دین کو کامل اور معتدل دین اور اس کے نبی کو آخری نبی قرار دیا گیا ہے کہ اس کی وفات کے بعد اب مسلمان کے لیے مقررہ ضابطۂ حیات و ضابطۂ اخلاق اور عقیدہ میں کسی طرح کی کمی و بیشی نہیں ہوگی۔

اس سلسلہ میں کوئی شخص خواہ ولی ہو یا عالم دین، ماہر شریعت ہو یا حاکم مسلمین زندگی کے طے کردہ احکام و ہدایات میں کوئی تغیر نہیں کرسکتا، وہ صرف تشریح اور تذکیر ہی کرسکتا ہے، اس طرح مسلمان ایک طرف عامل شریعت الٰہی ہے، دوسری طرف نگراں و داعی برائے عمل صالح ہے، وہ سب قوموں کے معاملہ میں گواہ بنایا جائے گا اور اس پر اس کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں گے۔

مسلمانوں کا یہ جامع مقام و عظیم مرتبہ و عظیم مقام و مرتبہ ہے جو ان کے علاوہ کسی

دوسری قوم کو نہیں ملا اور یہ اس کے لیے بڑے فخر وسعادت کی بات ہے، مسلمانوں نے اپنے اسی مقام ومرتبہ کی ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے اپنے عہد اول میں دنیا کے نقشہ پر گہرا اثر ڈالا اور نہ صرف یہ کہ سیاسی ومذہبی لحاظ سے دنیا میں انقلاب برپا کیا بلکہ اجتماعی وعلمی لحاظ سے بھی دنیا کو ایک غیر معمولی عہد میں داخل کردیا جائے چنانچہ صدیوں وہ زندگی کے ان میدانوں میں دنیا میں تنہا قائدانہ کردار انجام دیتے رہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ دنیا کے جدید عہد کو اپنے قدیم عہد سے جو شاندار انسانی قدریں اور علمی ترقی کی بنیاد حاصل ہوئی اس میں مسلمانوں کے تجربات اور ان کے برتتے ہوئے طریقوں کا بنیادی حصہ ہے، مسلمانوں کی خصوصیات کی بڑی خوبی دین ودنیا کی متوازن آمیزش اور مذہبی اور عملی زندگی کے جائز تقاضوں کا لحاظ رہا ہے، جو درحقیقت جدید ترقی یافتہ عہد کے لیے بڑا تحفہ ہے۔

پھر آہستہ آہستہ مسلمان اپنے ذاتی مفادات کے ٹکراؤ اور دنیا کی رونق وراحت سے متاثر ہونے لگے اور اس طرح وہ اپنے اعلیٰ مقام پر نہ رہ سکے اور ان برائیوں میں مبتلا ہونے لگے جو دوسری قوموں میں پائی جاتی تھیں اس طرح اپنے اعلیٰ مرتبہ سے نیچے گر کے انہوں نے اپنے پروردگار اور اسکے نبی کے احکامات کے نفاذ میں کوتاہیاں کیں اور شیطان نے مزید کروائیں، دوسری بگڑی ہوئی قوموں سے متاثر ہوئے پھر جدید عہد میں اپنے خیر کو چھوڑ کو یورپ کی کوتاہیوں میں مبتلا ہوئے اور غیروں کی نقل کی اور اس کو بہت اعزاز سمجھا، چنانچہ اسی روگردانی کے نتیجے میں وہ قعر ذلت میں چلے گئے۔ اور اپنے امتیاز وکمال کے مختلف پہلوؤں کے تارک بلکہ ان سے غافل ہوگئے۔

اس سے مسلمانوں کو بچانے اور اس دینی وقومی مذلت سے ان کو نکالنے کی ضرورت ہے اس لیے تعلیم وتربیت، دعوت اور حسنِ اخلاق کے ذریعوں کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

زیر نظر مضامین میں جو مسلمانوں کے مقام، ان کی ثقافتی نوعیت مغرب کے اثر سے ان میں سرایت کرجانے والے نقائص اور ان سب کا مداوا وازالہ کرنے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اس کے تین مضامین عربی میں لکھے گئے تھے، جن کا ترجمہ ہمارے ندوی عزیزوں (مولوی محمد فہیم اختر ندوی اور مولوی مطیع الرحمٰن عوف ندوی) نے کیا، میں ان عزیزوں کے اس

تعاون کا شکر گزار ہوں۔ طباعت کے معاملات میں مولانا شمس الحق ندوی، مولانا محمد غفران ندوی، مولوی محمد خالد فیصل ندوی اور خاص طور پر مولانا اقبال احمد ندوی نے تعاون کیا، میں ان سب کا بھی شکر گزار ہوں۔

امید ہے کہ یہ مضامین اپنے موضوع کی وضاحت کا صحیح حق ادا کریں گے اور پسند کیے جائیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

محمد رابع حسنی ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امت اسلامیہ کا مقام وسطیت

عظمت وکمال اور اعتدال

خدائے عز وجل نے امت مسلمہ کو امت وسط بنایا ہے اور اس کے لیے اس کے تین امتیازی اوصاف عطا فرمائے ہیں، ایک عظمت، دوسرا کمال، تیسرا اعتدال، یہ خدا کے آخری نبی سیدنا حضرت محمد (ﷺ) کی امت ہے، گذشتہ تمام انبیائے کرام نے آپ (ﷺ) کی آمد کی بشارت دی تھی، آپ (ﷺ) کی بعثت دنیا کی بستیوں کے مراکز (ام القریٰ) اور خدائے تعالیٰ کے عظیم ترین گھر (کعبہ مقدسہ) کے شہر میں ہوئی، خدا تعالیٰ کا یہ عظیم گھر روئے زمین پر اس کی عبادت اور اس کی بندگی کے لیے سب سے پہلے بنایا جانے والا گھر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا کہ: "اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ" (اس کو خدا نے مبارک اور تمام عالموں کے لیے باعث ہدایت قرار دیا) اسی مرکزِ عبادت کے ذریعہ اس امت کو عالی مرتبہ ملا، اس کے نبی کو آخری نبی ہونے اور اس پر دین وشریعت کے مکمل ہونے کا اعلان فرمادیا گیا اور اس کے بعد اس کی امت پر نبیوں کے کام کی ذمہ داری ڈال دی گئی۔ یہ ذمہ داری دعوت الی اللہ اور دوسری اقوام کی رہنمائی ونگرانی کی تھی اور اس کو کامل اور خصوصی فضیلت والی امت قرار دیا گیا۔ خدائے عز وجل کا ارشاد ہے:

"وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا"۔ (البقرۃ:۱۴۳)

(اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر

(آخرالزماں) تم پر گواہ بنیں)۔

وسطیت کی تشریح تفسیر قرآن کی روشنی میں

وسط کا لفظ اپنے اندر کمال، بہتری اور اعتدال تینوں اوصاف کے معانی سموئے ہوئے ہے، علامہ راغب اصفہانیؒ اپنی کتاب "معجم مفردات الفاظ القرآن" میں لکھتے ہیں:

> "کسی چیز کا وسط اس چیز کے بالکل درمیانی حصہ کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے "وسط صلبه" اس کا درمیان بہت مضبوط ہے، اور "ضربت وسط رأسه" میں نے اس کے بالکل بیچ سر پر مارا، یہ لفظِ "س" کے فتحہ کے ساتھ ہے، اگر "س" پر سکون کے ساتھ "وسْط" بولا جائے تو اس کے معنی بیچ کے ہوتے ہیں، کبھی وسط ایسی چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے دونوں جانب اچھے نہ ہوں، اور وہ خود دونوں جانب کی خرابی سے پاک ہو، مثلاً "هذا أوسطهم حسباً" یعنی یہ ان میں سب سے اچھے نسب کا ہے۔ ایسے شخص کو کہا جائے گا جو اپنی قوم کا سب سے عالی رتبہ ہو، اسی طرح ایسی سخاوت جو بخل اور اسراف دونوں کے درمیان ہو، اسے بھی وسط کہا جائے گا، حاصل یہ ہے کہ وسط کا استعمال افراط اور تفریط سے پاک بالکل درمیان کے معنی میں ہوتا ہے، اسی لیے عدل، انصاف اور برابری جیسے معانی کی وضاحت کے لیے اسی لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً (اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی یعنی مرکزی امت بنایا ہے)۔(۱)

امام احمد بن جعفر طبری اپنی کتاب "جامع البیان فی تفسیر القرآن" میں فرماتے ہیں:

> "وسط" کلام عرب میں برتر و عمدہ کے معنی ظاہر کرتا ہے، چنانچہ جب کسی کی عالی نسبی بتانی ہوتی ہے تو کہتے ہیں "فلان واسط الحسب في قومه" اور "متوسط الحسب" "واسط" اور "وسط" دونوں استعمال ہوتے ہیں، کہا جاتا ہے۔ "هو وسط في قومه وواسط" جس طرح ایک دوسرا عربی لفظ

---

(۱) صفحہ نمبر ۵۹۴، ۵۹۵ (دارالکتب العلمیة بیروت)

ہے"یابس" کہا جاتا ہے "شاة یابس اللبن ویبسة اللبن" قرآن کریم میں ہے:۔فاضرب لهم طریقا فی البحر یبساً۔

عربی شاعر زہیر بن ابی سلمٰی کہتا ہے ؎

هم وسط ترضی الأنام بحكمهم
اذا نزلت احدی اللیالی بمعظم

(وہ لوگ درمیانی وبہتر ثابت ہوتے ہیں، ان کے فیصلہ پر ساری مخلوق مطمئن ہوتی ہے، جب کبھی کسی شب میں کوئی سخت بات پیش آتی ہے)

مصنف فرماتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ اس جگہ ''وسط'' کے معنی کسی چیز کے دونوں کناروں کا درمیانی حصہ ہے، جیسے گھر کا وسط، یعنی مرکزی اور برتر جگہ اس معنی میں لفظ ''وسط'' کے ''س'' پر زبر ہے، سکون کے ساتھ پڑھنا درست نہیں ہے، نیز اللہ تبارک وتعالیٰ نے امت مسلمہ کا وصف بتاتے ہوئے انہیں ''وسط'' قرار دیا، مطلب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امت مسلمہ دین کے معاملہ میں ایسی درمیانی اور متوازن راہ پر ہے کہ نہ تو ان کے یہاں عیسائیوں کے مانند غلو اور افراط ہے، جنہوں نے رہبانیت اختیار کی اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کو کیا کیا بنا ڈالا، اور نہ یہودیوں کے مانند کوتاہی اور تفریط ہے، جنہوں نے کتاب خداوندی میں تحریف کی، نبیوں کو قتل کیا، خدا پر جھوٹ باندھا اور کفر کیا اور متوازن راہ سے بھٹک گئے، اللہ تعالیٰ کو توازن پسند ہے، اسی لیے امت مسلمہ کو خدا تعالیٰ نے اس وصف سے متصف قرار دیا''۔(۱)

حافظ ابن کثیر ''تفسیر القرآن الکریم'' میں مندرجہ ذیل آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطاً لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً. (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں امت

---

(۱) تفسیر آیة :وکذلك جعلناکم امة وسطاً الخ

وسط (درمیانی امت) بنایا، تا کہ قیامت کے دن تم تمام امتوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ ہوں) آیت کریمہ میں لفظ ''وسط'' سے مراد مرکزی ہے، کہا جاتا ہے "القریش أوسط العرب نسباً و داراً" یعنی قریش مرکزی یعنی سب سے بہتر نسب اور مقام والے ہیں، رسول اکرم (ﷺ) اپنی قوم میں ''وسط'' تھے۔ یعنی نسب میں سب سے اشرف تھے''۔ اسی طرح درمیانی و مرکزی نماز کو "الصلوٰۃ الوسطیٰ" کہا گیا ہے، احادیث کی کتابوں کے مطابق یہ عصر کی نماز ہے، پس جب خدائے عز وجل نے اس امت کو ''وسط'' سب سے بہتر بنایا تو اسے سب سے مکمل شریعت، پائدار دستور اور واضح ہدایات سے نوازا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ، هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ. مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْداً عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ". (الحج:۷۷) (اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے، اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی (اور تمہارے لیے) تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے تو جدوجہد کرنا) تا کہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں، اور تم لوگوں کے بارے میں شاہد ہو۔) (۱)

''فتح القدیر'' کے مصنف رقمطراز ہیں:

"و کذلك جعلنکم (ہم نے تمہیں ویسا ہی بنایا)۔ ایک مطلب یہ ہے کہ جس طرح کعبہ زمین کا درمیانی حصہ ہے، اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا، ''وسط'' کا معنی بہتر اور معتدل ہے، آیت قرآنی کے اندر دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں، عربی شاعر زہیر کے درج ذیل شعر میں بھی دونوں معانی مراد لینا ممکن ہے۔

---

(۱) ۱/۱۹۰ (قدیمی کتب خانہ اردو باغ کراچی، پاکستان)

هم وسط ترضى الأنام بحكمهم
اذا نزلت احدى الليالي بمعظم

(وہ درمیانی اور بہتر لوگ ثابت ہوتے ہیں، ان کے فیصلہ پر ساری مخلوق مطمئن ہوتی ہے جب کسی شب میں کوئی سخت بات پیش آتی ہے۔)

ایک دوسرا شعر ہے۔

انتم أوسط حتى تعلموا
بصغير الأمر أو احدى الكبر

(تم لوگ درمیانی قبیلہ کے لوگ ہو حتیٰ کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کی خبر ہوتی ہے)

آیت کے اندر "وسط" سے توازن کا معنی خود نبی کریمؐ سے منقول ہے، لہٰذا یہی معنی مراد لیا جائے گا، اسی معنی میں ایک دوسرے شاعر کا شعر ہے۔

لاتذهبن في الأمور مفرطاً
لاتسألن ان سألت شططا
وكن من الناس جميعاً وسطا

(معاملات میں حد سے تجاوز نہ کرو، اگر سوال کرو تو سوال میں زیادتی نہ کرو، اور تمام لوگوں میں بالکل معتدل اور درمیانی انسان بنو)۔(۱)

چونکہ "وسط" غلو سے بھی پاک ہے اور تقصیر سے بھی دور، اس لیے وسط سزاوار تعریف ہے، یعنی اس امت وسط نے نہ تو غلو کیا، جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ کیا، اور نہ اس نے کوتاہی کی جس طرح یہودیوں نے اپنے انبیاء کے سلسلہ میں کی، کہا جاتا ہے: "فلان أوسط قومه وواسطهم" (یعنی فلاں اپنی قوم میں درمیانی اور مرکزی ہے)۔

اسی آیت "وكذلك جعلنكم أمة وسطاً......الخ کی تشریح کرتے ہوئے مشہور عالم و صاحب قلم استاد سید قطبؒ لکھتے ہیں:

"اس آیت کے ذریعہ امت مسلمہ کی حقیقت اور اس کا کردار واضح ہو کر سامنے

(۱) فتح القدیر از علامہ شوکانی صفحہ نمبر ۱۴۴ (دار ابن حزم، بیروت)

آجاتا ہے، تاکہ امت مسلمہ اپنی ذمہ داری کی گرانباریوں کو محسوس کرے
اور اس کا حق بھرپور طریقہ پر ادا کرنے کے لیے مناسب تیاری کرے''۔(۱)

لفظ''وسط'' اپنے اندر جن گوناگوں معانی کو سمیٹے ہوئے ہے، امت مسلمہ ان سب کی مصداق ہے، خواہ "وسط" کو "وساطة" (درمیانی ہونا) سے مشتق مان کر حسن ومعتدل اور بہتر ہونے کے معنی مراد لیں، اور وسط کے معنی توازن واعتدال قرار دیں یا پھر مادی اور محسوس معنی درمیانی حصہ اختیار کریں۔امت مسلمہ کے مختلف پہلوؤں سے وسط ہونے کی تشریح اس طرح کرتے ہیں، یہ امت اپنے تصور اور اعتقاد میں امت وسط ہے، شعور اور فکر میں وسط (معتدل ومعیاری) ہے، نظم وضبط میں وسط ہے، میل جول اور تعلقات میں وسط ہے، یہ امت مکانی اعتبار سے بھی وسط ہے اور زمانی اعتبار سے بھی وسط ہے۔فرماتے ہیں:

''یہ ذی شان امت جس کی یہ ذمہ داریاں اور عظیم کارگزاری ہے، وہ یقیناً اس کی سزاوار ہے کہ گرانباریوں کو اٹھائے اور قربانیاں پیش کرے کیونکہ قیادت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، اور رہنمائی کا فریضہ کچھ قربانیاں چاہتا ہے''۔

اب تک لفظ''وسط'' کے ان معانی ومفہوم کا تذکرہ تھا جو کتب تفسیر میں بیان کیے گئے ہیں، اب دیکھیں حدیث شریف نے اس لفظ کے کن معانی کا تذکرہ کیا ہے۔

وسطیت کی تشریح حدیث شریف کی روشنی میں

"مجمع بحار الانوار" میں ان احادیث کی طرف اشارہ ہے، جس میں لفظ "وسط" وارد ہوا ہے، نیز ان کی تشریح کرتے ہوئے علامہ محمد طاہر پٹنیؒ فرماتے ہیں:

''حدیث پاک میں ہے "خير الأمور أوسطها" یعنی درمیانی امور تمام کے تمام لائق ستائش ہیں اور دونوں کنارے مذموم، چنانچہ سخاوت قابل تعریف ہے، کیوں کہ یہ فضول خرچی اور بخل دونوں کے درمیان ہے، شجاعت لائق ستائش ہے کہ یہ بزدلی اور جوش میں بے قابو ہو جانے کی صفتوں کے بیچ میں ہے، ایک چیز جس قدر دونوں کناروں سے دور ہوگئی، اسی قدر دونوں کی مذمتوں سے محفوظ

(۱) فی ظلال القرآن ۱۳۱/۱ (دار الشروق، بیروت)

ہوگی، دونوں کناروں سے سب سے زیادہ دوروسط ہوتا ہے اس لیے وہ بہتر قرار پایا۔حدیث میں ہے:"الوالدأوسط أبواب الجنة"یعنی والد جنت کا سب سے بہتر دروازہ ہے، والد کی اطاعت جنت میں داخلہ کا بہترین طریقہ ہے،کہا جاتا ہے:"انه من أوسط قومه"یعنی وہ اپنی قوم میں سب سے اشرف اورعالی نسب ہے، وسط، وساطۃ، دونوں سے لفظ"وسط" مشتق ہے، کہا جاتا ہے:"انظروا رجلاً وسیطاً" یعنی"حسیباً فی قومه" (اپنی قوم میں حسب نسب والا ہے) اسی سے ہے:"الصلوٰۃ الوسطیٰ" کیونکہ یہ نماز اورنمازوں سے افضل اورزیادہ اجروالی ہے، یا یہ کہ یہ نماز دن کی دونمازوں اوررات کی دونمازوں کے درمیان ہے، اسی اختلاف مفہوم کی وجہ سے اس نماز کے تعین میں اختلاف ہوگیا کہ آیا یہ عصر کی نماز ہے یا فجر کی یا کوئی اور، اسی معنی میں بولتے ہیں"أوسط الجنة وأعلاها"یعنی افضل جنت۔"(۱)

امت مسلمہ کا دوسری امتوں پرامتیاز وتفوق

اس سے معلوم ہوا کہ امت مسلمہ حسن وفضل اورتوازن واعتدال دونوں معنوں میں وسطیت سے آراستہ ہے،ایک دوسری آیت میں بھی اس امت کی صفت فضل کا ذکرآیا ہے:

"کُنْتُمْ خَیْرَاُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ"۔(آل عمران: ۱۱۰)

(مومنو! جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔)

ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں متعدد احادیث کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

(۱) مجمع بحار الانوار ۵/۵۸ (مکتبة دارالایمان المدینة المنورة)

''مسند امام احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، اور مستدرک حاکم میں حضرت حکیم بن معاویہ بن حیدۃ کی روایت ہے، وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسول اکرم (ﷺ) نے فرمایا: تم لوگ ستر امتوں کو جانو گے اور خدا کے نزدیک تم لوگ ان سب سے بہتر اور معزز ہو گے''۔ یہ حدیث مشہور ہے امام ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت سعیدؓ سے بھی اس مفہوم کی روایت مروی ہے، اس امت کو یہ مرتبہ وشرف اپنے پاک پیغمبر سیدنا محمد (ﷺ) کی وجہ سے حاصل ہوا ہے آپ خدا کی سب سے معزز مخلوق اور تمام رسولوں میں افضل ہیں۔ خدا نے آپ کو ایسی کامل شریعت عطا فرمائی جو آپ (ﷺ) سے قبل کسی نبی اور رسول کو عطا نہیں ہوئی تھی، اس شریعت پر عمل کی تھوڑی مقدار لوگوں کے بڑے بڑے اعمال کے مساوی ہو جاتی ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالرحمٰن نے بیان کیا، ان سے ابن زبیر نے اور وہ عبداللہ بن محمد بن عقیل کے واسطے سے محمد بن علی (ابن الحنفیہ) سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اکرم (ﷺ) نے فرمایا ''مجھے وہ چیزیں عطا کی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں عطا کی گئی'' ہم نے دریافت کیا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! وہ چیزیں کیا ہیں؟ فرمایا: رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی، مجھے زمین کی کنجیاں دی گئیں، میرا نام احمد رکھا گیا، مٹی میرے لیے مطہر بنا دی گئی اور میری امت کو سب سے بہتر امت بنایا گیا''۔ حضرت امام احمد بن حنبل اس واسطہ سے تنہا روایت کرنے والے ہیں، اس کی سند حسن ہے۔''(۱)

اس امت کی فضیلت پر وہ آیت بھی گویا ہے، جس میں خدائے عزوجل نے اس امت کے لیے سربلندی وغلبہ کے حصول کا تذکرہ فرمایا ہے:

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۳۹۱

وَأَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ"(آل عمران:۱۳۹)
(اگرتم مومن (صادق) ہوتو تم ہی دوسروں سے بلند و برتر ہوگے)۔

لیکن خدائے پاک پروردگار نے اس سربلندی و برتری کو ایمان کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اس امت کو ایمان ہی کی بنیاد پر سربلندی وغلبہ حاصل ہوسکتا ہے، وہ ایمان جس کا حکم خود خدا نے دیا ہے اور رسول کریم (ﷺ) نے اپنی ذات مبارکہ اور اپنے جاں نثاروں کی زندگی میں اسے اتار کر دکھایا ہے۔

یہی ایمان امت مسلمہ کو رفعت و سربلندی اور غلبہ و اقتدار کے بام عروج پر فائز کرسکتا ہے، جس کا تذکرہ اس آیت میں بھی ہے:

"كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔" (آل عمران ۱۱۰)
(مومنو) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو)۔

اس امت کے دوش پر جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے اس کا دائرہ سارے عالم پر محیط ہے، اللہ تعالیٰ نے اس امت کے متعلق فرمایا کہ "أخرجت للناس" لوگوں کے لیے سامنے لائی گئی ہے عربی لفظ "الناس" تمام نسل انسانی کو شامل ہے، خدا تعالیٰ نے اس امت کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) کے متعلق یہ بھی فرمایا کہ "أرسل الی الناس کافة" ان کی بعثت تمام لوگوں کی طرف ہوئی ہے اور وہ "رحمة للعالمین" سارے عالموں کے لیے رحمت ہیں، آیت کریمہ ہے:

"وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ"۔(سبا:۲۸)
(اور (اے محمد) ہم نے تم کو تمام ہی لوگوں کے لیے خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے'')۔

دیگر انبیاء سابقین کے متعلق آتا ہے کہ وہ اپنی اپنی مخصوص اقوام کو مخاطب بناتے تھے تو "یاقومی" اے میری قوم! کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی بیان فرمایا کہ ان کی

بعثت ان قوموں کی جانب ہوئی تھی، مختلف انبیاء علیہم السلام کے متعلق قرآن کہتا ہے:

"وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحاً اِلیٰ قَوْمِہٖٓ اِنِّی لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ"۔(ھود:۲۵)

(اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو (انہوں نے ان سے کہا) کہ میں تم کو کھول کر ڈر سنانے والا، اور یہ پیغام پہونچانے والا ہوں)

"وَاِلیٰ عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوداً"۔(ھود:۴۹)

اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو (بھیجا))

"وَاِلیٰ ثَمُودَ اَخَاھُمْ صٰلِحاً"۔ (ہود:۶۱)

اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو (بھیجا)

وَاِلیٰ مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْباً (ہود:۸۴)

اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو (بھیجا)

"وَلِکُلِّ اُمَّةٍ رَّسُولٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُولُھُمْ قُضِیَ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ"۔(یونس:۴۷)

اور ہر ایک امت کی طرف پیغمبر (بھیجا گیا) جب ان کا پیغمبر آتا ہے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

امت مسلمہ کی اہم ذمہ داری

اس امت کی فضیلت اور اس کی عظمت وشان نیز دیگر اقوام کے درمیان اس کے امتیاز کے یہ چند نمایاں پہلو تھے، ان سب سے معلوم ہوا کہ امت مسلمہ اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ تمام اقوام کی رہنمائی کرے اور ہر علاقہ میں قیادت ورہنمائی کا فریضہ انجام دے، قیامت کے دن امت مسلمہ ہی ان تمام امتوں پر گواہ ہوگی، اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت میں اس امت کو دعوت الی اللہ کا حکم دیا ہے۔

وَلْتَکُنْ مِنْکُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُونَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَامُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ"۔(آل عمران:۱۰۴)

(اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے)۔

خود نبی کریم (ﷺ) نے بھی اپنی امت کو تبلیغ و دعوت کا حکم دیا، فرمایا:

"بلغوا عني ولو آية"(۱) (میری طرف سے پہونچاؤ خواہ ایک آیت ہی ہو)

اس کے اولین مخاطب اور ان صفات کمال کے مصداق وہ خوش نصیب حضرات جنہیں حضور علیہ السلام کی صحبت بابرکت نصیب ہوئی، جنہوں نے آپ کی ڈگر پر چل کر دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا، پھر اس کے مخاطب آپ (ﷺ) کی امت کے وہ تمام لوگ ہوں گے جو قیامت تک آتے رہیں گے، آپ (ﷺ) کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اکثر سرزمین عرب کے تھے، لیکن آپ نے اس ذمہ داری کو کسی ایک جنس یا ایک زمانہ یا کسی خاص علاقہ کے اندر محصور نہیں رکھا، خدا نے آپ (ﷺ) کو تمام لوگوں کی طرف بھیجا تھا، اور آپ (ﷺ) کو سارے عالم کے لیے رحمت بنایا تھا، آپ پر اپنے دین کی تکمیل فرمائی تھی، خود آپ (ﷺ) نے دین کی اس ہمہ گیری اور آفاقیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"لافضل لعربی علی عجمی ولالعجمی علی عربی ولالأبیض علی أسود ولالأسود علی أبیض الا بالتقویٰ کلکلم من آدم وآدم من تراب"۔ (۲)

(کسی عربی کو عجمی یا کسی عجمی کو عربی پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر تقویٰ کے علاوہ کسی اور وجہ سے فضیلت نہیں ہے، تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے پیدا کیے گئے تھے)۔

امت کا عالمی منصب اور کام

اس کا نمونہ خود آپ (ﷺ) کے صحابہ کرامؓ میں جلوہ گر تھا، آپ (ﷺ) کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے والوں میں روم کے گورے صہیبؓ بھی تھے، حبش کے کالے بلالؓ بھی، اور فارس کے

---

(۱) بخاری: کتاب الانبیاء، باب ذکر عن بنی اسرائیل (حدیث نمبر ۳۴۶۱) (۲) مسند احمد: حدیث نمبر ۲۳۸۸۵

زردسلمانؓ بھی، اس لیے کہ آپ (ﷺ) کی بعثت عالمی تھی، پھر ایک زمانہ کے لیے بھی نہیں بلکہ قیامت تک انسانیت کی رہنمائی وقیادت کا عظیم رول آپ (ﷺ) کے ساتھ وابستہ تھا، اور اللہ عزوجل نے آپ ؐ کی اس عالمگیر دعوت کو آپ ؐ کی راستباز امت کے ذریعہ جاری وساری رکھا، اسے دوسری امتوں پر گواہ بنایا، اپنے دین کو عالمگیر اور دوسرے ان تمام ادیان کے لیے ناسخ بنایا جو اپنے اپنے محدود علاقوں اور دائروں میں کام انجام دے رہے تھے۔ یہ دین اپنی آفاقیت اور ہمہ گیریت کی وجہ سے کامل ومکمل دین بن کر آیا، اسے کسی وضاحت کی ضرورت نہ رہی، اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا:

"اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا"۔ (مائدہ:۳)

(آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کیا)۔

اس دین کے اسی کمال نے اس کو سارے عالم کا مقتدا بنایا، اور پوری حیات انسانی کے لیے ایک دستور وقانون کے مقام پر فائز کیا، امت مسلمہ پر نعمت خداوندی کا اتمام اس بات کی واضح دلالت تھی کہ خدائے عزوجل نے اس امت کو جو مقام بخشا ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس امت کو امتیازی طور پر رفعت وسربلندی اور فضل وشرف عطا کیا گیا ہے، اسے دیگر اقوام پر گواہ بنایا گیا، دین کا کمال، نعمت الٰہی کا اتمام اور اس دین کے ذریعہ رضائے الٰہی کا حصول ان تینوں نے مل کر اس امت کو جو بلند مقامی عطا کی ہے اور جس منصب پر فائز کیا ہے، وہاں تک کوئی دوسری قوم نہیں پہونچ سکی ہے، اسی فضیلت کو محسوس کرکے ایک یہودی نے حضرت عمرؓ بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا تھا، کہ "اگر یہ آیت ہم لوگوں میں نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن بنالیتے"۔

امت کا آسمانی صحیفہ

اس امت کی صفت وسطیت میں یہ بھی شامل ہے کہ خدا تعالیٰ کی آخری کتاب اس پر نازل کی گئی، وہ کتاب جو حق وباطل کے درمیان فارق ہے، جسے خدا نے نگہبان اور شفاء بنایا ہے اور جس کی

حفاظت کا خود ان الفاظ میں وعدہ فرمایا ہے:

"اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَ"۔(حجر:۹) (بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم نے ہی اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں)۔

قرآن مجید ہی وہ تنہا آسمانی کتاب ہے، جس کے حروف، نقطے حتی کہ رسم الخط تک میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں واقع ہوئی، یہ کتاب اس طرح بھی منفرد ہے کہ اسے مکمل طور پر زبانی یاد کیا جاتا ہے، اور اس کے حفاظ اس بڑی تعداد میں ہیں، جس کا شمار ممکن نہیں، قرآن اس باب میں بھی بے مثال ہے کہ لوگ اسے محض ایک مقدس دینی کتاب کی تلاوت کے طور پر نہیں پڑھتے بلکہ علمی، دینی، تشریعی (قانونی) اخلاقی حتی کہ ادبی استفادہ کی غرض سے بھی پڑھتے ہیں، لوگوں نے اسے سب سے بلیغ اور فصیح کتاب تسلیم کیا ہے، قرآن خود گویا ہے: قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا غَيۡرَ ذِىۡ عِوَجٍ (زمر:۲۸) (یہ) قرآن عربی ہے جس میں کوئی عیب اور اختلاف نہیں)۔

جامع کمالات نبی

اس امت کے رسول بھی آخری رسول ہیں، خدا نے انہیں خاتم الانبیاء بنا کر تمام لوگوں کی جانب اور سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا، رحمت کسی ایک امت یا کسی ایک شہر و ملک کے لیے نہیں، گذشتہ انبیاء نے آپ (ﷺ) کی بشارت سنائی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ارشاد ہوا:

يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوۡرٰٮةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ۔(صف:۶)

(اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں (اور) جو کتاب مجھ سے پہلے آچکی ہے، (یعنی) تورات اس کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا ان کی بشارت سناتا ہوں)

ہمہ گیر و جامع شریعت

خدا نے آپ (ﷺ) کی ذات والا صفات کو جامع کمالات بنایا، رسالت کے مختلف

پہلو، قیادت کے نوع بہ نوع خصائص اور بلند انسانی اخلاق آپ (ﷺ) کی ذات میں جمع تھے، آپ (ﷺ) کی شریعت ہمہ گیر تھی، سیاسی اور فوجی قیادت کی اعلیٰ صلاحیت کے آپ (ﷺ) حامل تھے، وسیع پیمانہ پر ایک علمی وفکری بیداری آپ (ﷺ) نے پیدا کی، انفرادی اوراجتماعی دونوں اعتبار سے نہایت مضبوط بنیادوں پر آپ (ﷺ) نے اسلامی زندگی کی تعمیر فرمائی، آپ (ﷺ) کی ذات سے انسانی تاریخ کے ایک نہایت زریں وروشن باب کا آغاز ہوا، ایسا باب جیسا اس سے قبل دیکھنے میں نہ آیا تھا، جہاں دین بھی تھا اور دنیا بھی تھی، اخلاق بھی تھے اور سیاست بھی تھی، دعوت بھی تھی اور عمل بھی تھا، جہاں انسانیت کی خدمت بھی تھی اور حق کا دفاع بھی، مسلح جہاد اور نبرد آزمائی کے طریقے بھی تھے اور صلح کی زندگی بھی، تاریخ انسانی نے اس ذات والا صفات سے جس دور کا آغاز کیا وہ اس اعتبار سے تاریخ کا بڑا عظیم الشان دور تھا کہ یہ انسان کی دینی، سماجی، فکری اور قائدانہ زندگی پر محیط تھا۔

مساوات اور وحدت طبقات

اس رسول کی پاکیزہ شریعت حیات انسانی کے مختلف گوشوں پر سایہ فگن تھی، اس شریعت نے تمام انسانی طبقات، گروہوں اور عناصر کو ایک لڑی میں پرودیا اوران سب کو ایک جادہ کا مسافر بنادیا وہ جادہ فضیلت، حق اور خیر تھا:

"قُلْ هَـذِهِ سَبِيلِيْ أَدْعُو إِلَى اللّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ"(یوسف: ۱۰۸)
(کہہ دو میرا راستہ تو یہ ہے، میں خدا کی طرف بلاتا ہوں (ازروئے یقین وبرہان) سمجھ بوجھ کر)۔

اس نے فقر ومسکنت کو عزت ورفعت میں بدلا، اس کے لیے زکوٰۃ کا نظام جاری کرکے مالداروں کی دولت میں فقراء کا حصہ متعین کردیا، رسول کریم (ﷺ) نے فقرا کو بھی ایک مقام بلند عطا کردیا، فرمایا:

"رب أشعث مدفوع على الأبواب لو أقسم على الله لأبره"۔(۱)
(بعض پراگندہ حال ومعمولی حالت کے اور دروازوں سے ڈھکے دے کر ہٹا دیئے جانے والے ایسے ہیں کہ اگر وہ خدا پر (یعنی خدا پر یقین رکھنے کی بنیاد

پر) قسم کھالیں تو خدا ان کی قسم کی لاج رکھ لے گا)

اور فرمایا:

"فانما تنصرون و ترزقون بضعفائکم"(۲)

(تم اپنے کمزوروں ہی کی وجہ سے رزق پاتے ہو اور مدد کے مستحق ہوتے ہو)

اس نے اہل دولت وثروت کے غرور وسرکشی کو مٹایا، آپ (ﷺ) نے فرمایا:

"انہ یأتی الرجل السمین العظیم یوم القیامۃ لایزن عنداللّٰہ جناح بعوضۃ"(۳)

(ایسا بھی ہوگا کہ قیامت کے دن کوئی تنومند صحت مند بڑا معلوم ہونے والا آدمی آئے گا مگر خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا)

دولت مندوں پر یہ فرض کیا گیا کہ وہ فقراء کی مدد کریں، دولت کی ریل پیل میں سے کچھ فیصدی نکال کر ضرورت مندوں کی حاجت روائی کریں، زکوٰۃ کی واجب شدہ مقدار تو نکالنا لازم ہے ہی، اس کے علاوہ بھی خود اپنی اپنی جانب سے نفلی صدقات بھی کریں۔ شریعت اسلامی نے اس عادلانہ نظام کے ذریعہ انسانوں کے دونوں طبقوں کے درمیان ایک گونہ معاشی اشتراک پیدا کردیا۔

عادلانہ نظام

اس نے فرمانرواؤں کو حکم دیا کہ تواضع اختیار کریں، رعیت کی خدمت کریں، ان کی راحت وآرام اور حاجت روائی کے لیے اپنی نیند قربان کریں، آپ (ﷺ) نے پابند عدل وانصاف فرماں روا کے متعلق فرمایا کہ وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ سے سایہ حاصل کرے گا، جس دن اس کے سوا اور سایہ نہ ہوگا۔

اس نے سیاسی حقوق میں مساوات کو حکومت وفرماں روائی کی بنیاد قرار دیا، چنانچہ حاکم کی فضیلت محکوم پر صرف انتظامی دائرے کی حد میں تسلیم کی گئی، ذرا دیکھئے اس مساوات کا

(۱) مسلم: کتاب البر والصلۃ والادب، باب فضل الضعفاء والخاملین (حدیث نمبر۲۶۸۲)

(۲) ابو داؤد: کتاب الجهاد، باب فی الانتصار برذل الخیل الضعفۃ (حدیث نمبر۲۵۹۴)

(۳) بخاری: کتاب التفسیر، باب أولئك الذين كفروا بآيات ربهم ولقائه.....الآیۃ

نمونہ، رسول عربی (ﷺ) جنہیں خدا نے تمام بنی نوع انسانی پر فضیلت بخشی ہے، اپنی وحی ان پر نازل فرمائی، اپنا عظیم پیغام انہیں عطا کیا، یہ ذات ذیشان خود اپنے بارے میں کیا فرماتی ہے، صحابہ کرامؓ سے ارشاد ہوتا ہے:

"لاتقوموا كما يقوم الأعاجم يعظم بعضهم بعضاً"(۱)

(میری آمد پر) تم لوگ مت کھڑے ہوا کرو جس طرح اہل عجم کھڑے ہوتے ہیں اور بعض بعض کی تعظیم کرتے ہیں)۔

آپ (ﷺ) کی عادت شریفہ بھی یہ تھی کہ جب آپ (ﷺ) صحابہ کرامؓ کی مجلس میں تشریف لاتے تو جہاں تک مجمع ہوتا وہیں پر بیٹھ جاتے (یہ اور بات تھی کہ پھر مجمع اپنا رخ آپ (ﷺ) کی طرف کر لیتا)۔

علم کی سرپرستی و ہمت افزائی

میدان علم و معرفت کو لیجئے جو انسان کی مابہ الامتیاز صفت اور دیگر تمام مخلوقات پر وجہ فوقیت ہے، تو اسلام نے اس میدان کی اہمیت کو بھی خوب سراہا ہے، اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کے تاکیدی فرمان موجود ہیں، آسمان سے اترنے والی سب سے پہلی وحی میں علم اور اشاعت وحصول علم کے ذریعہ یعنی قلم کو سراہا گیا ہے:

"اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ"(علق:۳،۴) (پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا)۔

رسول کریم (ﷺ) نے اپنے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ لکھنا سیکھیں، جو حفاظت علم کا ذریعہ ہے، ان سب چیزوں نے اسلام میں علم کو جو مقام و مرتبہ عطا کیا، سابقہ کسی مذہب اور کسی امت میں یہ مرتبہ نہیں تھا، اسلام میں علماء وفضلاء نے علم پر جو توجہ دی وہ تو اپنی جگہ پر ہے، خود وحی آسمانی اور امر الٰہی نے اس کا اہتمام کیا، یہ سب امت مسلمہ کی وسطیت کے مظاہر ہیں، اس امت کے لیے یہ مقدر تھا کہ یہ سائنس اور ٹکنالوجی کے دور کا سامنا کرے گی، ساتھ

(۱) ابو داؤد: کتاب الادب، باب الرجل يقوم للرجل يعظم بذلك (حدیث نمبر ۵۲۳۰)

ہی اسے قیامت تک رہنا بھی تھا اور قیادت کا فریضہ بھی انجام دینا تھا، تاریخ کے ہر دور اور زندگی کے ہر میدان میں رہنمائی کرنی تھی اور ان میں ادوار میں ایک دور علم وفکر کا بھی آنے والا تھا، امت مسلمہ نے اپنے دورِ اقتدار میں عراق، فارس، اندلس، مصر، مراکش اور ہندوستان وغیرہ میں نمایاں کردار ادا کر کے تاریخ کا ایک روشن باب تیار کر ڈالا۔

جامع سیاسی نظام

سیاست کے میدان میں دیکھیے، اسلام نے جس نظام کو اختیار کیا وہ شاہی نظام اور جمہوری طریقہ دونوں کا جامع تھا، اس نے دونوں نظاموں کی خوبیوں کو اختیار کیا اور دونوں کی برائیوں کو چھوڑ دیا، اسلام نے یہ جامع نظام ایسے زمانہ میں پیش کیا جس وقت لوگوں کے لیے ان دونوں نظاموں کے درمیان جمع و ہم آہنگی ممکن نہ تھی، اسلام کے اس جامع نظام کا فرمانروا قوم کا نمائندہ ہوتا ہے، قوم کے تمام افراد کے ساتھ مساوات برتتا ہے، قوم کی دولت کے ساتھ نہایت محتاط رویہ رکھتا ہے، اگر محتاج رہا تو اپنے لیے اس میں سے صرف بقدر ضرورت لیتا ہے۔ ورنہ اس سے استغنا برتتا ہے، خود حضور اکرم (ﷺ) امتیازات وخصوصیات اور کمالات کے باوصف مسلمانوں کے اموال میں غایت درجہ احتیاط اختیار فرماتے تھے، آپ (ﷺ) نے اپنے اہل وعیال اور اہل خاندان پر زکوٰۃ وصدقات کو حرام قرار دیا، اپنی جائداد اور مال کو اپنی وفات کے بعد عام مسلمانوں کا حق قرار دیا اور اپنے وارثوں کو محروم کر کے انہیں بیت المال میں داخل کر دیا، اسلام میں کوئی شخص فرمانروا سے کچھ طلب کرتا ہے یا اس پر اعتراض کرتا ہے تو حاکم اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اس کی طرف توجہ دے، یہ تو حاکم کی ذمہ داریاں تھیں، اسلام نے رعایا پر حاکم کے جو حقوق عائد کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ رعایا سختی کے ساتھ اپنے حاکم کی اطاعت گزاری کرے، اللہ تعالیٰ نے مومن فرمانروا کا تذکرہ اپنے اور اپنے رسول (ﷺ) کے ساتھ فرما کر اس کی قدر و منزلت کو دوبالا کر دیا، فرمایا:

"أَطِيعُواْ اللَّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ"۔(نساء:۵۹)

(اور خدا اور اس کے رسول (ﷺ) کی فرماں برداری کرو اور جو تم میں

تمہارے امیر وحاکم ہیں ان کی بھی)۔

رعیت وفرمانروا اور حاکم ومحکوم کے درمیان اسی تعاون وخیر خواہی کی فضا میں اسلام کا سیاسی نظام رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی ہدایات کے تحت جاری تھا، یہ نظام اپنے اجراء میں کسی خلل اندازی کی خلل اندازی اور کسی فساد پرور کی فساد پروری سے محفوظ تھا، کیونکہ یہ بغیر کسی تحریف کے کتابوں میں مدون اور موجود تھا، اسلام کے اولین دور میں یہ نظام عملی شکل میں ظاہر ہو چکا تھا، بعد کے ادوار میں بھی ان کے مختلف حالات میں اس نظام کی شکلیں ظاہر ہوتی رہیں اور مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں میں اسلامی شریعت کی اتباع کے روشن نمونے حالات کی ابتری کے باوجود نمایاں ہوتے رہے۔

مرد وزن کے حقوق

خدائے عزوجل نے اسلامی شریعت میں بنی نوع انسان کی دونوں جنس مرد وعورت کی حیثیتوں کو قریب کیا، مرد کی شدت وسطوت میں تخفیف فرمائی اور عورت کو اس کے مقام سے اونچا اٹھا گیا، گذشتہ قوموں میں عورت کی حیثیت محض ایک سامان کی تھی، یا ایک ایسا مال جس سے صرف مادی طور پر فائدہ اٹھایا جاتا تھا، خود وہ کسی چیز کی مالک نہیں ہوتی تھی، شادی سے قبل اپنے والدین کے ہاتھوں میں ایک تجارتی سامان کے مانند ہوتی اور شادی کے بعد اپنے شوہر کے ہاتھ میں فائدہ اٹھایا جانے والا ایک مال ہوتی، شوہر اگر اس کو تختۂ مشق وستم بنا رہا ہوتا تو بھی اسے یہ حق نہ تھا کہ شوہر سے جدا ہو سکتی، اس طرح وہ انتہائی پست زندگی بسر کر رہی ہوتی، سامان کی طرح ہاتھوں ہاتھ منتقل ہوتی رہتی، شوہر کے انتقال کے بعد بھی اس کے خاندان سے جدا نہیں ہو پاتی، عورت کا یہ ذلت آمیز مقام جس طرح گذشتہ قوموں میں تھا، آج بھی ملتا ہے۔

اسلام کی عدل گستری اور کرم فرمائی نے عورت کو بھی مالا مال کیا، شوہر پر ضروری قرار دیا کہ عورت کے حقوق ادا کیے جائیں، اس کو شوہر کے انتخاب کا بھی حق دیا گیا، اگر شوہر کے ساتھ گزر بسر ناممکن ہو جائے تو اس سے گلو خلاصی کا حق دیا، والدین، رشتہ دار اور شوہر کے

ترکہ میں عورت کا حصہ متعین اور لازم کیا، جس میں ادنیٰ کمی کی بھی گنجائش نہیں دی، پھر ان حقوق کی حفاظت بھی خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی، اور انہیں مختلف قیود وشرائط سے گھیر دیا، تاکہ عورت وشوہر کے درمیان نیز ان دونوں کے اہل خاندان کے درمیان معاشرتی زندگی میں بے راہ روی نہ آنے پائے۔

اسلام نے بتایا کہ عورت کو مرد کی طرف سے اس کے فطری تقاضے پورے ہونے کا حق ملتا ہے اور مرد کے لیے عورت اس کے فطری تقاضے پورے ہونے کا ذریعہ ہے، لیکن تاریخ کے مختلف ادوار میں مرد وعورت دونوں نے جنسی تقاضوں کا ناجائز استعمال کیا، عورت اس میدان میں زیادہ ظلم کی شکار ہوئی، کیونکہ مرد کی فولادی قوتوں کے سامنے عورت جسمانی اعتبار سے بھی کمزور تھی اور اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کے وسائل کی بھی مالک نہ تھی، اس کے نتیجہ میں مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں جنسی بگاڑ بڑے پیانہ پر پھیلا۔

پردہ کا حکم

اسلام نے بگاڑ کے اس سرچشمہ پر کڑی بندشیں لگائیں اور مختلف سخت احکام جاری کر کے اس پر روک لگائی، اس نے لازم کیا کہ عورت اپنے کو حتی الوسع آڑ میں رکھے، جسم کے اظہار اور کھلی آزادی سے گریز کرے، حقیقی رشتے والوں کے علاوہ تمام لوگوں سے پردہ کرنا ضروری قرار دیا، زینت کی جگہوں کو سوائے شوہر کے کسی اور کے سامنے کھولنے پر سخت بندش عائد کی تاکہ اخلاقی بگاڑ کا یہ سرچشمہ بند ہوجائے، مردوں پر عورتوں سے میل جول کے حدود قائم کیے تاکہ کھلا اختلاط فتنہ کا سبب نہ بنے، عورت کے سلسلہ سے مرد کو حکمرانی اور نگہبانی سونپی اور مرد کے سلسلہ سے عورت کو کارہائے زندگی میں معاون وشریک بنایا، دونوں کو بالکل ایک جیسا مقام عطا نہیں کیا، اس میں ایک عظیم حکمت کارفرما تھی، وہ یہ کہ ایک میدان میں دو برابر کے شریک اشخاص کے درمیان اتفاق اور ہم آہنگی نہیں پیدا ہوتی، بلکہ اختلاف پھر جھگڑا اور فساد وبگاڑ تک معاملہ پہونچ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے الوہیت کے متعلق اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

"لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا" (انبیاء: ۲۲) (اگر آسمان اور زمین

میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو (زمین و آسمان) درہم برہم ہو جاتے)۔

اس کائنات ارض وسماء میں اگر ایک خدا کے بجائے متعدد خدا ہوتے تو ان میں اختلاف پیدا ہوتا اور یہ کائنات ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی۔

ان آسمانی ہدایات کے ذریعہ خداوند قدوس نے مرد و عورت کے واسطے ایک ایسا جامع اور مانع نظام عطا فرمایا کہ اگر ٹھیک ٹھیک اسے عملی جامہ پہنایا جائے تو کسی قسم کا خلل یا بگاڑ اس میں راہ نہیں پا سکتا۔

اعتدال و ہمہ گیری

یہ تمام چیزیں امت مسلمہ کی افضلیت اور دیگر اقوام پر اس کی فوقیت کے کھلے شواہد ہیں، ان سب کا تعلق اس امت کی ''وسطیت'' (امت وسط ہونے) سے ہے، زندگی کے ان مختلف اور گوناگوں پہلوؤں کو ان خوبیوں کے ساتھ جمع کر لینا، امت وسط ہی کا کمال ہے، تاریخ انسانی نے اس کی مثال گذشتہ کسی امت میں اور کسی زمانہ میں نہیں دیکھی، علم وفن اور تہذیب وثقافت کے بڑے بڑے مراکز حکومت وسیاست اور عسکریت وقانون کے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی اس کی مثال نہ پہلے دیکھنے کو ملی تھی نہ اب دیکھنے کو ملتی ہے۔

پچھلے زمانوں میں ماحول کے بگاڑ اور پچھلے فساد کو ختم کرنے کے لیے خدائے عزوجل نے اپنے رسولوں کے ذریعہ اپنی جو ہدایات واحکام بھیجے تھے، لیکن چونکہ وہ محدود علاقوں اور مخصوص زمانوں کے لیے تھے اور شر وفساد کی قوتیں عام طور پر زیادہ سخت تھیں، اس لیے اکثر مواقع پر ان دعوتی کوششوں کے ذریعہ شر وفساد کی بیخ کنی نہ ہوئی، اور ان کی پاداش میں عذاب خداوندی نے نازل ہو کر فساد کی ان قوتوں کو تہس نہس کر دیا۔

سب سے آخر میں یہ امت وسط ظہور پذیر ہوئی، خاتم المرسلین حضرت (ﷺ) کی عالمی رسالت اس پر سایہ فگن تھی، یہ رسالت جامع بھی تھی اور ہمہ گیر بھی، آپ علیہ الصلاۃ و السلام کے بعد امت محمدیہ (ﷺ) نے اس رسالت کے تئیں ذمہ داریوں کو اٹھایا، اور خداوند قدوس نے اس طرح اس رسالت کے لیے ابدیت ودوام طے فرما دیا۔

اس کے اندر خدا نے وہ صلاحیتیں رکھ دیں جس کے ذریعہ یہ ہر بگاڑ کا سامنا کر سکے اور ہر مشکل کا حل پیش کر سکے، دنیا میں بسنے والی تمام قوموں اور امتوں کے مسائل ومشکلات کا حل پیش کر کے ان کی رہنمائی کر سکے، کیا یہ خوبیاں امت مسلمہ کی برتری وفوقیت اور تمام دوسری امتوں پر اس کی فضیلت وبلندی کی دلیل نہیں ہیں۔ اس امت کی یہ صلاحیت کسی ایک زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ جب تک اس روئے زمین پر کوئی انسان موجود ہے، یہ امت اپنی کتاب اور سنت کے سرچشموں سے استفادہ کر کے زندگی کے مختلف میدانوں کے مسائل اور مشکلات کا حل بطریق احسن پیش کرتی رہے گی۔

آیت قرآنی "وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً" میں امت مسلمہ کی جس وسطیت کا ذکر ہوا ہے وہ اپنے پہلو میں فضیلت وسربلندی کے ان تمام معانی کو سموئے ہوئے ہے، ساتھ ہی توازن واعتدال کے معنی بھی نمایاں ہیں، یقیناً امت مسلمہ صفت اعتدال سے بھی متصف ہے، اور اس امت کے احوال نیز اس کی شریعت کا طریقۂ کار اس کی دلیل ہے، قرآن کریم اور حدیث نبوی (ﷺ) میں مختلف اقوال اس سلسلہ میں بھی وارد ہیں، حدیث نبوی (ﷺ) ہے، خیر الأمور أوسطها (سب سے بہتر معاملہ درمیانی معاملہ ہے)۔

دین ودنیا کی جامعیت

اس امت کی خصلتیں اور اس کے دینی ودنیوی فرائض اعتدال وتوسط کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں، اس امت کو دنیا ترک کر دینے اور رہبانیت اختیار کرنے کی تعلیم نہیں دی گئی، ہاں اسے یہ حکم دیا گیا ہے کہ تقویٰ وزہد کے زیور سے آراستگی کے لیے سعی وکوشش کرے، اسے یہ حکم دیا گیا کہ توجہ الی اللہ اور تضرع وانابت اختیار کرے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اہل وعیال سے بے توجہی برتی جائے اور اس دنیا میں خوش کن زندگی کے حصول کی کوشش نہ کی جائے، خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے مومن بندوں کو حکم دیا کہ دنیا وآخرت دونوں کی بھلائی طلب کریں، یہ فرمان خداوندی بھی اس امت کے توازن واعتدال اور توسط کو بتلا رہا ہے، فرمایا:

"رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"
(پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت بخشیو
اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھیو)

میانہ روی اور توازن

حدیث میں تین صحابہ کرامؓ کے قصوں میں اسی اعتدال وتوسط کی وضاحت ہے، واقعہ اس طرح ہے کہ تین صحابہ کرامؓ نے یہ عزم کیا کہ وہ ہر چیز سے کٹ کر ہمیشہ عبادت میں مشغول رہیں گے، ایک نے کہا "میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا" دوسرے نے کہا: "میں رات میں کبھی نہیں سوؤنگا" بلکہ ہمیشہ راتوں کو عبادت میں بسر کروں گا"۔ تیسرے نے کہا: "میں کبھی شادی نہیں کروں گا" جب آپ (ﷺ) کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا: "خدا کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کا خوف کھانے والا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور روزہ چھوڑتا بھی ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور شادی بھی کرتا ہوں جو شخص میرے طریقہ سے گریز کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔" (۱)

حضور اکرم (ﷺ) کی صفات کریمہ کے بیان میں آتا ہے کہ جب کبھی آپ (ﷺ) کو دو کاموں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ (ﷺ) ان دونوں میں آسان کو اختیار فرماتے، آپ (ﷺ) ہر چیز اور ہر بات میں میانہ روی کو پسند فرماتے۔

اعتدال ومیانہ روی امت مسلمہ کی نمایاں صفت ہے، دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے اعمال میں یہ وصف نمایاں ہے، اور یہی وصف اس امت کے لیے دیگر امتوں پر وجہ امتیاز ہے، یہاں نہ عیسائیوں کے مانند غلو ہے، نہ یہودیوں کی طرح تقصیر۔

امام طبری لفظ "وسط" کی تشریح میں اسی معنی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "میرے نزدیک وسط اس جگہ پر اس معنیٰ میں ہے کہ مذکورہ چیز کا وہ حصہ جو اس کے دونوں کناروں کے درمیان ہوتا ہے، جیسے گھر کا درمیانی حصہ، نیز میرا خیال ہے کہ خدائے عزوجل نے اس امت کو امت وسط اس لیے فرمایا کہ یہ امت اپنے دین میں درمیان راہ پر ہے،

(۱) بخاری: كتاب النكاح باب الترغيب في النكاح (حدیث نمبر ۵۰۶۳)

عیسائیوں کی مانند غلونہیں کیا ہے، جنہوں نے رہبانیت اختیار کرلی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیا کیا کہہ لیا، اور یہودیوں کی مانند تقصیر نہیں کی ہے، جنہوں نے اللہ کی کتاب میں ردوبدل کیا، اپنے نبیوں کا انکار کیا اور ان کو جھٹلایا اور ان کا قتل تک کیا، یہ امت ان دونوں سے بچ کر اہل توسط واعتدال قرار پائی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس وصف کے ساتھ ان کا تذکرہ فرمایا جو خدا کو سب سے زیادہ پسند ہے اور درمیانی امر ہے۔

مرکزیت ووسطیت

زندگی کے مختلف میدانوں میں اس امت کے توسط واعتدال کی مثالیں بہت ہیں، دین وشریعت پر عمل پیرا ہونے اور مادی وسائل سے مستفید ہونے میں یہ راہ اعتدال پر ہے، پھر اس امت کا زمانہ بھی دوعہدوں کے درمیان خط فاصل ہے، ایک گذشتہ اقوام کا عہد جو ہزاروں سالوں پر مشتمل ہے، دوسرا آخرت کا وہ عہد جو اس امت کا زمانہ ختم ہونے اور ساتھ ہی کائنات فنا ہونے تک پھیلا ہوا ہے۔

اس امت کی آمد سے قبل انسان زمین کے مختلف خطوں میں اور مختلف ٹولیوں میں بٹا ہوا تھا، تہذیب وثقافت کا کوئی رابطہ انہیں جوڑتا نہ تھا، اس وقت انسان نے ''مادہ'' کو اپنا ایسا نخچیر نہ بنایا تھا کہ جس طرح چاہے اس میں ٹکنالوجی تصرف کرے، اس سے حیرت کن چیزیں تیار کرے، مشینی دنیا میں نئی نئی فتوحات کرے، اس طرح یہ امت زمانہ کے اعتبار سے بھی دوعہدوں کے درمیان متوسط ہے۔

مرکزیت کی صفت قبلہ اوّل میں

اس امت کی ساری نشاط انگیزیوں اور کارفرمائیوں کا منبع ومرکز بھی عالم مسکون کے بالکل درمیان اور وسط میں ہے، وہ مقدس شہر جسے خدا تعالیٰ نے ''ام القریٰ'' کے نام سے نوازا، دنیا کے کونے کونے میں اہل اسلام وہاں کھنچ کر چلے آتے ہیں، اس طرح وہ تمام عالم کے لوگوں کا مرکز توجہ اور دینی محور ہے، ''مکہ'' آباد دنیا کا بالکل وسط یعنی مرکزی جگہ پر واقع ہے،

اسی مقدس شہر میں خدا کا وہ عظیم الشان گھر ہے جو دنیا کے بتکدوں میں خدا کا پہلا گھر ہے، خدا نے اسے لوگوں کے لیے جائے پناہ، جائے امن اور جائے قیام بنایا، یہ دونوں الفاظ کعبہ کی مرکزیت اوراس کے شہر کی مرکزیت کو بتارہے ہیں، مکہ جو اس امت کا نقطۂ آغاز اور اصلی مرکز ہے، وہ قبلہ ہے جس کی طرف سارے عالم کے مسلمان رخ کرتے ہیں، اسی کے نام پر سب جڑتے ہیں، اور اسی کے گرد سب گردش کرتے ہیں، لفظ "قیاما" اپنے مختلف اشتقاقات کے ساتھ اس عظیم امت کی اہمیت اور اس کے دین کی عظمت کو بتلاتا ہے، یہ معانی خود قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں، مثلاً آیت کریمہ ہے:

"یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ آمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ"۔(مائدہ:۸)

(اے ایمان والو! خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو)

عظمت دین کے متعلق اسی لفظ سے ارشاد ہے:

ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَالنَّاسِ لَایَعْلَمُوْنَ۔(یوسف:۴۰)

(یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

نیز ارشاد ہے:

قُلْ اِنَّنِی هَدٰانِی رَبِّی اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْناً قِیَماً مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفاً۔(انعام:۱۶۱)

(کہہ دو کہ میرے پروردگار نے سیدھا رستہ دکھادیا ہے (یعنی) دین صحیح مذہب ابراہیمؑ کا جو ایک (خدا) ہی کی طرف سے تھے)

خلاصہ یہ ہے کہ اس امت مسلمہ کی ''وسطیت'' مختلف پہلوؤں سے نہایت روشن اور واضح ہے، یہ امت نہایت بیش قیمت اور بڑی اہمیت والی ہے، اس کے دو پہلو ہیں ایک پہلو شرف قیادت کا ہے اور دوسرا پہلو مرکزیت وتوسط اور اعتدال کا ہے۔

امت اسلامیہ کا عالمی منصب اور ذمہ داریاں

امت اسلامیہ تمام امتوں کی رہبر و نگراں

امت مسلمہ کو وسطیت کی صفت کی بنا پر دوسری امتوں کے مقابلے میں جو ذمہ دارانہ اور برتر مقام حاصل ہوا اس مقام کے مطابق اس کو پروردگار کی طرف سے کام کی ذمہ داری بھی سپرد کی گئی، جس کا ذکر اس سلسلہ میں آئی ہوئی آیت قرآنی میں اس طرح آیا ہے:

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً"۔(سورۃ البقرہ:۱۴۳)

(اور تم کو ہم نے امت وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر نظر رکھنے والے اور گواہ بنو، اور رسول یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہ ہوں)۔

اس میں ''الناس''، یعنی ''لوگوں'' کے لفظ میں سارے انسان آجاتے ہیں۔

امتوں کا آغاز وحدت وحق پرستی سے

قرآن مجید میں ''الناس''، یعنی ''لوگ'' کے لفظ کو سورۂ نساء کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام بندگان خدا کو مخاطب کرتے ہوئے استعمال کیا گیا ہے، فرمایا:

"يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً"۔(النساء:۱)

(اے لوگو! اپنے پروردگار کی بندگی اختیار کرو، جس نے تم کو صرف ایک جان سے

پیدا کیا، یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا، اوران سے ان کا جوڑا پیدا کیا یعنی حضرت حوّا کو پیدا کیا اور پھران دونوں سے بہت سے مردوں اورعورتوں کا سلسلہ پھیلا دیا، چنانچہ تم اللہ سے ڈراختیار کروجس کے نام کے حوالہ سے تم آپس میں ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو، اورآپس کے رشتوں کا لحاظ کرو، بیشک اللہ تمہارانگراں ہے۔)

یہ آیت تمام انسانوں کوخدائے واحد کی بندگی اوراطاعت کا حکم دیتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ انسانی برادری اپنے مختلف خاندان، قوم اور ملک کے فرق کے باوجود سب ایک باپ اورایک ماں سے پیدا ہوئے ہیں، یعنی سب کی اصل ایک ہے، اس طرح تمہارا پیدا کرنے والا بھی ایک اور تمہارا جدا کبر بھی ایک، لہٰذا تم کو اپنے رب واحد یعنی خالق و پالنہار کا شکر گزاراور تابعدار بننا چاہئے، کہ تنہا اسی نے تم کو پیدا کیا، اورتمہاری نسل چلائی اوراسی کے حکم ومرضی پر سارے انسانوں کو چلنا ہے، خدا کی بڑائی اوراحسان مانتے ہوئے اسی کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا یہ حکم سارے انسانوں کے مورث حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے چلا آرہا ہے۔

انسانی معاشرہ کا تنوع

حضرت آدمؑ اللہ کے پہلے پیغام بر تھے اور شروع میں ان کی سب اولاد اپنے باپ حضرت آدمؑ کے بتائے ہوئے صحیح راستہ پر تھی، پھر جیسے جیسے نسلوں پر نسلیں آتی گئیں اور یہ اولاد مختلف علاقوں میں پھیلتی گئی، اورایک دوسرے سے دور ہوتی گئی، ایک دوسرے سے دوری کی وجہ سے وہ اپنے اپنے ذہن وخواہش سے نئی نئی باتیں اختیار کرتی چلی گئی، اس طرح خدا کی تابعداری اس راستہ سے جو حضرت آدمؑ نے بتایا تھا ہٹتی گئی اور محض وہم وخیال کی بناء پر خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوقات میں سے نفع یا نقصان پہونچانے والی چیزوں کو خدا کی طرح مؤثر اور متصرف سمجھ کر خدا کی طرح لائق عبادت بنالیا، اوراس طرح خدا کی نافرمانی، کفراور شرک کا اثر مختلف قوموں کے عقیدہ وعبادت میں داخل اوران کے مذہب کا حصہ بن گیا اوران کی

اصلاح کے لیے رہبروں اور مصلحوں کی ضرورت پڑی۔

سابقہ قوموں میں انبیاء کی بعثت

چنانچہ اس فریضہ کو انجام دینے کے لیے مختلف قوموں اور علاقوں میں اللہ کی طرف سے مختلف زمانوں میں نبی بھیجے گئے، نبی اپنی اپنی قوم کو سمجھاتے اور صحیح راستہ کی طرف لوٹنے کو کہتے، لیکن انسان کا نفس اور شیطان ان باتوں کے ماننے میں رکاوٹ بنتا، کچھ لوگ مان لیتے اور اکثر لوگ نہیں مانتے تھے، بہر حال اللہ کی طرف سے نبی آتے رہے اور قومیں بھی ابھرتی اور گرتی رہیں، بے شمار قومیں اور بیشمار نبی آئے، جن میں سے اہم قوموں اور اہم اہم نبیوں کا تذکرہ قرآن میں آیا ہے، اور لوگوں کو اپنے باپ دادا کی بتائی باتوں کے ذریعہ بھی اپنے سے پہلے کے لوگوں کی باتوں کا علم ہوا ہے۔

نبیوں کے آنے کا یہ سلسلہ حضرت عیسیٰؑ تک جاری رہا، ہر علاقے میں نبی آئے اور اس طرح کم کوئی قوم ایسی بچی جس میں نبی نہ آیا ہو، قرآن مجید نے نبیوں کا حال بیان کرتے ہوئے ان کی بنیادی بات یہ بتائی کہ ہر نبی نے پہلی بات تو یہ کہی کہ اپنے پروردگار کو ایک سمجھو اسی نے تم کو پیدا کیا ہے، اور جو کچھ تمہارے پاس اور تمہارے اردگرد ہے سب اسی کا دیا ہوا ہے، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اس لیے کسی اور کو اس میں شریک نہ مانو، کسی دوسرے کی اطاعت وعبادت نہ کرو، اور خدائے واحد کے سوا کسی دوسرے کی بندگی نہ کرو، انبیاء نے توحید کے اس پیغام کے بعد اپنی اپنی قوم کو ان دیگر خرابیوں کی طرف بھی توجہ دلائی جو ان میں پائی جاتی تھیں، موٹی موٹی باتیں جن کا تذکرہ الگ الگ قوموں کے تذکرہ میں آیا ہے ان میں لوگوں پر ظلم وزیادتی، معاملات میں دھاندلی، فحاشی وبداخلاقی، امانت میں خیانت، لین دین میں بے ایمانی اور زندگی کی دیگر برائیوں کا الگ الگ قوموں کے تذکرہ میں ذکر ملتا ہے، مثلاً قوم عاد کے تذکرہ میں شرک کی مذمت کے بعد تکبر واکڑ اور اپنی طاقت کا متکبرانہ اظہار اور بیجا زور وزبردستی سے بچنے کا اور نبی کی بات ماننے کے حکم کا ذکر ملتا ہے، قوم لوط کے تذکرہ میں شرک کی مذمت کے ساتھ ان کی حیاسوزی اور بداخلاقی اور جنسی بے راہ روی کا تذکرہ ملتا ہے، قوم مدین کے تذکرہ میں شرک یعنی غیر اللہ کی

بندگی سے منع کرنے کے ساتھ ناپ تول میں دھاندلی کرنے اور دیگر زیادتیوں اور خرابیوں سے ممانعت کا تذکرہ ملتا ہے، قوم فرعون کے تذکرہ میں شرک کی مخالفت کے ساتھ، اقلیتی فرقہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ غلاموں جیسا معاملہ کرنے اور ان کو ذلیل بنائے رکھنے اور کمزوروں پر اپنی بالادستی اور عظمت کا رعب جمانے اور اپنی جھوٹی شان وشوکت کی خاطر ان سے غلط فائدہ اٹھانے سے منع کیا گیا، اور اس کے ساتھ مختلف حالات اور برائیوں کا تذکرہ مختلف انبیاء کے یہاں ملتا ہے، لیکن ہر جگہ پہلی بنیادی بات یہ ضرور ملتی ہے کہ خدائے واحد کی بندگی کی جائے اور اس کے ساتھ کسی اور کی بندگی کرنے اور اس کی ذات وصفات میں کسی اور کو شریک کرنے سے بچا جائے اور یہ غلطی ہرگز نہ کی جائے، اس طرح تاریخ انسانی کی ہزاروں قوموں میں ہزاروں نبی آئے اور انہوں نے اپنی اپنی امتوں کو سمجھانے اور ان کے عقیدہ و کردار کی اصلاح کا کام کیا۔

جامع خصوصیات نبی

یہ نبیوں کی آمد اور اصلاح عقیدہ وعمل کے کام کا سلسلہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تسلسل کے ساتھ جاری رہا، حضرت عیسیٰؑ کے بعد کچھ عرصے کے لیے روک دیا گیا، گویا یہ اشارہ تھا کہ انسانوں کے حالات اور ان کی زندگیوں کے نظام میں اب بڑی تبدیلی آنے والی ہے، اس کی تمہید کے طور پر کچھ عرصے کے لیے انبیاء کے بھیجے جانے میں قدرے توقف کیا گیا، پھر یہ توقف تقریباً چھ سو سال کا تھا جس کے بعد سارے عالم کو ایک اکائی قرار دیتے ہوئے اس پورے عالم کے لیے صرف ایک نبی طے کیا گیا اور اس کو مرکزیت، جامعیت اور قیامت تک کے لیے کام کو استوار کرنے والا نبی بنایا گیا۔

جامعیت اور مرکزیت کے حامل اس نبی اور اس کی نبوت کو دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک کے لیے کامل اور دائمی نبوت قرار دیا گیا، کیونکہ اب دنیا آپس کے تعارف وتعلقات میں ایک دوسرے سے قریب ہوتی جا رہی تھی اور اس طرح پورا عالم ایک وحدت بنتا جا رہا تھا، اس کی بنیاد پر ان کا نبی بھی اب ایک ہی نبی ہو سکتا تھا جس کو عالمی وسعت کے مطابق جامعیت کے ساتھ بھیجا گیا، یہ ایک اہم تاریخی واقعہ تھا، اس کی بناء پر اس نبی کے آنے کی بشارت تقریباً

ہرنبی نے پہلے ہی سے اپنی قوم کودی تھی، سورہ صف میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ذکر ہے "مبشرا برسول یأتی من بعدی اسمہ احمد" کہ بشارت دیتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ایک رسول میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا۔

جامع صحیفۂ سماوی اور جامع ومکمل شریعت

حضرت محمد (ﷺ) جو آخری نبی بنا کر بھیجے گئے اور ان کی نبوت کے جامع اور تا قیامت ہونے کے مطابق ان کو جو کتاب دی گئی وہ کتاب بھی انسان کی دینی واخلاقی روحانی پہلوؤں کے لیے جامع بنائی گئی اور جو احکام دینی دیئے گئے وہ بھی جامع اور مکمل دئے گئے، اور یہ طے کردیا گیا کہ گذشتہ عہد میں عہد بہ عہد قوموں کے فرق سے ان کے دینی احکام میں جو تغیر وتبدل کیا جاتا رہا تھا اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، اب دنیا کی ترقی اور حالات میں تبدیلی ایسی نہیں ہوگی کہ اس کے لیے احکام بدلتے رہیں، اب یہ احکام ایسے دیئے جارہے ہیں جو برابر قائم رہ سکیں گے اور سب کے لیے ابدی ہوں گے، چنانچہ نبی کی زندگی کے آخری سال یہ یہ اعلان کردیا گیا:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً" (سورۃ المائدہ: ۳)

(اب تمہارے لیے میں نے تمہارے دین کو مکمل کردیا، اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کردیا، اور اسلام ہی کو تمہارے لیے بحیثیت دین کے پسند کیا)

اس طرح اسلام کو خدا کا پسندیدہ اور ساری انسانیت کے لیے آخری اور مکمل دین قرار دیا گیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَام" (اب اسلام ہی اصل دین ہے)

"وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَالْاِسْلَامِ دِیْناً فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ"

(اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا تو اللہ کے یہاں مقبول نہ ہوگا)

اس طرح اب ساری انسانیت کے لیے صحیح راستہ کی رہنمائی اسی دین سے طے قرار

پاگئی جو آخری نبی محمد (ﷺ) کو پروردگار کی طرف سے بتایا گیا، اورانہوں نے اپنی اس آخری امت کو بتایا، اوراس میں سب کی فلاح رکھی گئی، اور پروردگار نے اپنے بندوں کے لیے جن کی زندگیوں میں نسلاً بعد نسلٍ صلاحیت اور خصوصیات کا کوئی بنیادا ور بڑا فرق نہیں ہوتا ہے یہ طے کردیا کہ سب انسانوں کو اب ایک ہی رہنمائی میں چلنا ہے جو کہ ان کے حالات وتغیرات کے لحاظ سے بھی ضرورت کے مطابق ہوگی، اس طرح یہ اشارہ دیدیا گیا کہ اب عہد بدل گیا نیا عہد جامعیت کا حامل ہے اس لیے کہ اس نئے عہد کی ترقیات ساری انسانیت کو ایک کنبہ میں تبدیل کردینے والی ہیں جن میں آپس میں ربط اور واقفیت کی شکلیں بھی قریب کردینے والی ہیں، اس میں الگ الگ معاملہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

علم کی وسعت وترقی میں مسلمانوں کا قائدانہ کردار

اس عہد کی دوسری خصوصیت علم کی ترقی ووسعت ہے، چنانچہ انسانی تاریخ میں علم میں اتنی وسعت کبھی نہیں ہوئی کہ تقریباً سارے انسانوں میں عام ہوجائے جتنی وسعت اس عہد میں ہوئی اوراس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کی بات جاننے اور ایک کا دوسرے تک بات پہونچانے کا کام بہت آسان ہوگیا کہ اگر کسی ایک جگہ سے آواز لگائی جائے تو پورے عالم میں پہونچ سکتی ہے، اس سہولت کی بناء پر بھی اس عہد کے لیے ایک ہی نبی جو جامع خصوصیات اور وسیع النظر اور کامل الصفات ہے سب کے لیے کافی ہے، جہاں تک علم کا تعلق ہے تو اس میں کمال کا ثبوت یہ ہے کہ اسلام کے نبی محمد (ﷺ) پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس کی ابتدا "اقرأ" یعنی پڑھو سے ہوئی، پھر اس میں قلم اور کتابت (یعنی لکھنے) کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، مزید یہ بات قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے اپنے رفقاء کو علم کی طرف متوجہ کیا اور اس کے رواج کی فکر کی اور علم کی طلب کرنے والے کی بڑی فضیلت بتائی چنانچہ اسلام کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ علم بھی پھیلتا چلا گیا اور یہ اس امت کی اہم خصوصیت ثابت ہوئی کہ وہ علم والی امت ہے اور اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہونچائے۔

اس طرح اس امت کے ذریعہ علم کو بہت ترقی اور عروج حاصل کرنا تھا اور انسانی

زندگی کے ایسے ایسے حقائق دریافت کر لینے تھے جو انسان کی فلاح وصلاح کے لیے ضروری ہیں، علم کی اہمیت وافادیت کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اسلام کے آغاز کے ساتھ ظاہر کر دیا گیا، قرآن مجید کی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورہ کا پہلا لفظ "اقــرأ" آیا کہ پڑھو اور اس کے بعد متصلاً آیت میں خدا تعالیٰ نے انسان کو علم عطا کرنے کو اپنی نعمت کے طور پر ظاہر کیا اور اس میں قلم کا خصوصیت سے ذکر کیا، اور اس کو علم کے فروغ کا ذریعہ قرار دیا اور متوجہ کیا کہ اس نعمت کی قدر کے ساتھ اسی کی عبادت کی جائے، پھر اس کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی طرف توجہ دی اور اس کے حصول کے لیے انتظام کی فکر کی جس کے نتیجہ میں علم اس امت کی دلچسپی کا خاص موضوع بنا، چنانچہ اس امت کے آغاز کے بعد صرف دو تین صدیوں کے اندر یہ امت علم کے اس مقام پر پہونچ گئی کہ جس میں پوری دنیا میں اس کا کوئی ثانی نہیں رہا، اور علم میں یہ امت کمال کے مقام پر پہونچ کر ساری دنیا کی معلم اور استاد بنی اور اس نے اپنی اس برتری کو چھ صدی تک برقرار رکھا چنانچہ ساتویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی عیسوی تک سب سے زیادہ علم رکھنے والی اور علم کو فروغ دینے والی امت یہی امت رہی، اور مسلمانوں کے لیے صرف مذہبی دائرے میں نہیں بلکہ لٹریچر میں سائنس میں اور تجرباتی علوم میں ممتاز اور نمایاں رہے، طب، ہیئت، ریاضی سے لے کر جغرافیہ اور جہاز رانی تک، نظم وانتظام سیاست اور حکومت اور فن حرب تک یہ کارنامے پھیلے ہوئے ہیں، پھر ان مختلف علوم میں تحقیق کو اس مقام تک پہونچایا کہ پرانے حقائق میں ترمیم اور نئے حقائق کا اضافہ کیا اور مذہبی علوم میں وہ کمال پیدا کیا جس میں کوئی دوسری قوم نہ پہلے مثال پیش کر سکی ہے اور نہ بعد میں اس کی مثال سامنے آئی، تفسیر قرآن، علوم حدیث اور شریعت اسلامی میں اسلامی سرمایہ کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی، موجودہ ترقی یافتہ قوموں یعنی مغربی دنیا کی قوموں نے عصری اور طبیعاتی علوم میں جو ترقی کی اس کا آغاز انہوں نے امت مسلمہ کی تعلیم گاہوں، مصنفوں اور حاملین علم سے فیض اٹھا کر کیا، اس فیض کے اثرات آج کی علمی ترقیات کی بنیادوں میں صاف طریقے سے محسوس کیے جا سکتے ہیں، اس امت کے علمی کمال نے بھی اس

کوساری امتوں کی گواہ بننے کا حقدار بنایا، اس لیے کہ قدیم عہد کی معلومات اس تک اس کے نبی کے ذریعہ اور آسمانی کتاب کے ذریعہ پہونچیں ہیں، اور نئے عہد میں پیدا ہونے والی قوموں کے متعلق وہ اپنی علمی صلاحیت و واقفیت و ترقی کی بناپر وہ صحیح طور پر واقف ہوتی ہے، اور اسی راہ سے وہ نئے عہد کے سارے انسانوں کو اللہ کا پیغام پہنچاتی اور پہونچا سکتی ہے۔

دعوت حق کی وسعت

اس عہد میں ذرائع نشر و ابلاغ کے آسان ہوجانے کی وجہ سے کوئی پیغام ایک جگہ مکمل ڈھنگ سے دیا جائے تو سب جگہ پہونچ جاتا ہے تو اس امت کی نظر اور اس کا پیغام عالم کے تمام گوشوں تک پہونچ جاتا ہے، اور یہ بات بھی اس کو امت وسط کی ذمہ داری پوری کرنے میں معاون بنتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس امت کو مزید یہ خصوصیت بھی عطا فرمائی ہے کہ اس کے داعی اور رہبر دنیا کے ہر خطہ میں پہونچے اور ان کے ذریعہ پیغام الٰہی ہر جگہ پہونچا، ایسی صورت میں جن لوگوں نے اسلام کی دعوت کو جاننے اور حق کی آواز کو سننے سے اپنے ذہن و دماغ بند کر لیے تو اس کی ذمہ داری انہی پر آتی ہے، ان کو اس بے توجہی پر معاف نہیں کیا جاسکتا اور ان کے ناواقف رہنے کا عذر آخرت میں قابلِ قبول نہیں ہوسکتا اور اس کی شہادت امت اسلامیہ قیامت کے روز دے سکے گی کہ دنیا کے تمام لوگوں اور قوموں تک پیغام حق پہونچا تھا اس پیغام کے پہونچانے کا ذریعہ یہ امت بنی اور اسی خصوصیت کی بنا پر اس امت کو خیر امت کہا گیا جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" (سورۂ آل عمران:۱۱۰) کہ تم بہترین امت ہو لوگوں کے لیے سارے عالم کے لیے) بھیجی گئی ہو، تم لوگوں کو اچھی باتوں کی ہدایت کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اس آیت میں اس امت کے خیر امت ہونے کے ساتھ اس کی طرف سے اصلاح کا کام اور حق کی کارکردگی کیے جانے کے تذکرہ کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا گیا کہ اس نے اپنی عملی زندگی کو ایمان سے آراستہ کیا، فرمایا "وتؤمنون باللہ" اللہ پر ایمان رکھتے ہو جس کا مطلب ہے تم دل سے مانتے اور اعلیٰ معیار کا عمل اختیار کرتے ہو۔

امت کی فرض شناسی اور علم وعمل کی جامعیت

یہ آیت اس امت کے اس مقام کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ یہ امت برتر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی اخلاقی اور عملی زندگی میں بھی اعلیٰ اور اکمل ہے، یہی وہ صفات ہیں جو اس امت کے مقام بلند کی تشریح کرتے ہیں، بلندی کے اس مقام پر ہونے کی وجہ سے باکمال خصوصیات اور درمیانی یعنی مرکزی جگہ کی حامل قوم بنی، اسی بات نے اس امت کو اس مقام کا حقدار بنادیا کہ وہ دوسروں کی نگران بنائی جائے، اور دوسروں کی گواہ قرار دی جائے، گواہ اس بات پر کہ اس کی معاصر قوموں نے حق کی آواز کو سن کر حق کو مانا کہ نہیں مانا، گذشتہ امتوں کے احوال اس امت کو اس کے نبی کے ذریعہ پہونچ چکے اور دین کے سلسلہ میں پروردگار کو جو تکمیل کرنی تھی وہ بھی کی جاچکی اور مزید یہ کہ دونوں مذکورہ باتوں کا علم اور تفصیلی معلومات کے محفوظ رہنے کا جو انتظام کردیا گیا ہے وہ بھی دنیا کی ہر امت کے مقابلہ میں زیادہ اور اکمل ہے، اور نئی قوموں کے حالات موجودہ علمی وسائل کی وسعت وترقی کی بناء پر اس سے مخفی نہیں، اس لیے اس سے بہتر قوموں کے حالات کی گواہ اور کوئی دوسری امت نہیں ہوسکتی تھی اور رہی خود یہ امت تو اس پر اس کے نبی کو گواہ بنایا گیا جنہوں نے اپنے عہد کے افرادِ امت کو خود دیکھا، اور اپنے بعد آنے والے افراد امت کا حال وحی کے ذریعہ جانا، اس طرح سے اس امت کے لیے وہ آیت پوری مصداق ہے جس میں فرمایا گیا

”وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً“ (سورۃ البقرۃ:۱۴۳)

(اور ہم نے بنایا تم کو درمیانی اور بلند امت تاکہ تم تمام لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ بنیں)

اب رہی یہ بات کہ اس امت نے اپنی ذمہ داری کو کہاں تک ادا کیا، اور اپنے مقام کے مطابق کس حد تک عمل کیا تو تاریخ بتاتی ہے کہ بڑے خاصے پیمانہ پر اور وسعت کے ساتھ اس کام کو اس نے بقدر امکان انجام دیا، تاریخ کے واقعات اور جدید عہد میں امت کی کارکردگی کے واقعات اس کے گواہ ہیں، مسلمان داعی اور رہبر ہر جگہ پہونچے، اور حق کی آواز

دور دور پہونچائی اور اس طرح سب پر حجیت قائم کی۔

اس باکمال اور بلند امت کے نبی بھی ایسے ہوئے کہ ان کو اللہ نے سارے عالم کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی بنایا، اور ان کو بھی عالمی سطح پر پیغام حق عالم کے چہار طرف پہونچانے کا ذریعہ بنایا۔

امتِ وسط کا مرکز بھی مقام وسط

اللہ تعالیٰ نے اس امت وسط یعنی مرکزیت رکھنے والی امت کے نبی کو ایسے شہر میں مبعوث فرمایا کہ جس کو آباد دنیا کے مرکز اور درمیان میں ہونے کی بناء پر وسطیت کا مقام حاصل ہے، اور وہیں سے اس امت وسط کا آغاز ہوا، یہ شہر مکہ ہے جو ساری دنیا کے معمور علاقوں کی درمیانی جگہ پر واقع ہونے اور امت اسلامیہ کے لیے بھی مرکزیت کا مقام رکھنے کی خصوصیت کا حامل ہے، عبادت واطاعت الٰہی کا مرکز وقبلہ ہے اللہ کی عبادت کے لیے بنائے جانے والے گھروں میں سب سے پہلے اسی کو بنایا گیا جس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا:

"اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبَارَكاً وَّهُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ" (سورہ آل عمران:۹۶)

(اور پہلا گھر جو رکھا گیا (بنایا گیا) لوگوں کے لیے یعنی اللہ کی عبادت کے لیے وہ ہے جو بکہ (مکہ) میں ہے جو بابرکت اور سارے جہانوں کے لیے ہدایت ہے۔)

سارے جہانوں کے لفظ سے یہ صاف اشارہ ملتا ہے کہ مکہ مکرمہ کا بیت اللہ صرف ایک قبلہ یا ایک ملک یا ایک علاقہ یا ایک زمانہ کے لیے نہیں، بلکہ سب کے لیے اور تا قیامت مرکز عبادت ہے اور رہے گا، امت مسلمہ کا آغاز اسی گھر سے ہوا، اور تا قیامت اس کے ساتھ اس کی وابستگی رہے گی، اور یہ گھر سارے جہانوں کے لیے مرکز ہدایت رہے گا، ساری قوموں اور سارے جہانوں کا مرکز اور مرجع ہونے کی بناء پر دنیا کے سارے علاقوں سے اس کے تعلق ووابستگی کی ضرورت تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سب کے لیے آسان بنادیا، جس کو قرآن مجید میں فرمایا گیا:

:"وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَاَمْنًا، وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى"(سورۃ البقرہ:۱۲۵)

(اور جب کہ ہم نے بیت اللہ کو عام لوگوں کے پہونچنے کی جگہ بنایا، اور ان کے لیے امن کی جگہ بنایا، اور تم اس جگہ کو اپنی جائے نماز بناؤ جہاں ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے)۔

امت اسلامیہ کا رشتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو اسی امت پر مکمل اور دائمی قرار دیتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس کا بنیادی تعلق طے فرمایا، حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ عظیم شخصیت ہیں جو خود بڑے نبی اور اپنے بعد آنے والے نبیوں کے مورث ہیں، اور خالص اللہ کی عبادت کے لیے قائم کیے جانے والے پہلے گھر کو باقاعدہ تعمیر کرنے والے، اور اس کو تعمیر کر کے اللہ کے حکم سے وہاں آنے اور وہاں سے وابستہ ہونے کا پہلا اعلانِ عام کرنے والے نبی ہیں اور یہ سب انہوں نے اللہ کے حکم سے کیا، قرآن مجید میں اللہ کے اس حکم کا ذکر یوں فرمایا گیا

"وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ"(سورۃ الحج:۲۷)

(لوگوں میں) یعنی سارے انسانوں میں مکہ عبادت کی غرض سے آنے کی آواز لگا دو، لوگ تمہارے پاس پہونچیں گے، پیدل بھی، کمزور سواریوں پر بھی جو طرح طرح کی گہری کھائیوں سے گزر کر آئیں گی)

اس کے ساتھ اس امت کے نبی آخر الزماں کو یہ بتایا گیا کہ آپ کو اس برگزیدہ نبی حضرت ابراہیمؑ جو آپ کے جد مورث بھی ہیں، کے مشروع کیے ہوئے راستہ پر چلنا ہے، فرمایا"وَاتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا" اس طرح ایک طرف مکہ کا بیت اللہ پورے عالم کے لیے دین حق کا مرکز اور ماویٰ وملجا ہوا، اور دوسری طرف شہر مکہ امت وسط کے لیے دین وسط کا مقام وسط بنا، اور وسط کا لفظ جو اپنے لغوی معنوں کے اعتبار سے مرکزیت توسط اور برتری کا مفہوم رکھتا ہے، یہاں پر مذکورہ بالا خصوصیات کی وجہ سے تینوں پر منطبق ہوا اور یہ امت

اسلامیہ کے مقام وسط سے مطابقت رکھنے کی مناسبت سے اس کے عبادت خانہ کو قیامت تک تمام اہل حق کی عبادت اور نماز کے قبلہ کا مقام حاصل ہوا، چنانچہ اللہ کی بندگی واطاعت قبول کرنے والے دنیا کے ہر سرے سے اور ہر مقام سے اس کو اپنی عبادت کا رخ بناتے ہیں، اور اس عبادت گاہ کی مرکزیت کو اپنے ذہن میں رکھنے کی پابندی کرتے ہیں۔

مکہ کی جغرافیائی وسطیت

اور عام جغرافی پہلو سے دیکھا جائے تو اس لحاظ سے بھی مکہ کو اپنے جائے وقوع کے اعتبار سے وسطیت حاصل ہے، جغرافیہ کی رو سے مکہ آباد دنیا کے بالکل وسط میں واقع ہے، مکہ کے شرق میں جتنے فاصلہ تک انسانی آبادی ہے، تقریباً اتنے ہی فاصلہ تک مغربی رخ پر آبادی واقع ہے، اور جس طرح اس کے شمالی رخ پر آبادی کا رقبہ ملتا ہے، تقریباً اتنا ہی جنوب کی جانب پایا جاتا ہے، اس کے علاوہ اس امت کے نبی کی بعثت کے وقت مکہ کے چہار طرف تقریباً ایک ہی طرح کے فاصلوں تک متمدن وترقی یافتہ علاقے واقع تھے، جن کا غلبہ ساری دنیا میں تسلیم کیا جاتا تھا، مشرقی وشمالی مشرقی جانب جزیرۃ العرب سے نکل کر ایران وخراسان وسندھ وترکستان تک متمدن اور طاقتور حکومتیں تھیں جن میں ساسانی فارسی شہنشاہیت تھی، اور شمالی وشمال مغربی جانب بازنطینی اور رومی شہنشاہیت تھی، اور یہ دونوں شہنشاہیتیں اس وقت کی دنیا کی سب سے مؤثر ومتمدن شہنشاہیتیں سمجھی جاتی تھیں، مکہ کے مغربی جانب مصر وسوڈان اور اس کے مغربی رخ پر مزید حکومتیں تھیں، اور سب مقام کے چہار طرف واقع متمدن علاقوں کے وسط میں سادہ اور فطری زندگی رکھنے وال شہر مکہ تھا، اس کو سارے انسانوں کے لیے ان کے قلب وروح کی ضرورت کو مدد دینے والا مرکز بنایا گیا، اس طرح امت وسط کے مرکز عبادت کو بھی وسطیت کا مقام عطا کیا گیا، اور یہیں سے مکمل اور تا قیامت انسانی ضرورت کو پورا کرنے والی ہدایت ورہنمائی کا آغاز ہوا۔

عالمگیر دعوت کا آغاز

عالمی دعوت دین ودعوت حق کے اول حاملین کو تیرہ (۱۳) سال تک اسی شہر مکہ میں

ان کے عظیم کام کو عزم وصبر و ہمت کے ساتھ انجام دینے کی مشق کرائی گئی پھر وسیع میدان عمل میں لایا گیا اور اس کے لیے مکہ سے منتقل ہو کر اس کے قریب کے شہر مدینہ میں ان کے کام کا مرکز بنایا گیا اس وقت سے مکہ تمام اہل حق کا مرکز عبادت اور مدینہ رہنمائی و نفاذ عمل کا مرکز بنا مکہ کی بے سہارا اور مظلوم زندگی سے نکل کر مدینہ میں مسلمانوں کو وسائل اور حفاظت کی زندگی حاصل ہوئی اور اس طریقہ سے اسی مرکز عمل سے اپنے مفوضہ کام کو پورے جزیرۃ العرب میں پھیلانے کا موقع حاصل ہوا، پھر مزید وسعت و موقع ملنے پر جزیرۃ العرب کے باہر کے ان حکمرانوں کو بھی پیغام دینے کی صلاحیت حاصل ہوئی جو اپنے ماتحت باشندوں اور قوموں کے حاکم ہونے کی بنا پر دعوت حق کی راہ م کو انجام دینا تھا۔

آپ (ﷺ) کے اس پیغام دعوت کو قبول کرنے یا نہ کرنے، ماننے یا نہ ماننے کی صورت میں دعوتِ حق کی جو عظیم ذمہ داری آپ (ﷺ) کی عظیم امت پر عائد ہوتی تھی اس کو اولاً آپ (ﷺ) کے خلفاء نے پورا کیا، اور رب واحد کی عبادت اور احکام الٰہی کی انجام دہی کا پیغام ساری دنیا کی قوموں اور تمام صاحب بصیرت حلقوں تک پہونچایا، دعوت حق کو عالمی سطح پر پہونچانے کا کام جو آپ (ﷺ) کے ذریعہ انجام پایا وہ آپ (ﷺ) کی حیات طیبہ کے آخری دس سال تھے، اس مدت کے اندر پورے جزمیں دیوار بنے ہوئے تھے، چنانچہ قبائل عرب کو دعوت دینے کے بعد جن کا تذکرہ آپ کی حیات طیبہ میں عام الوفود میں ملتا ہے، آپ نے مشرقی جانب واقع ساسانی شہنشاہیت کے حکمرانوں کو دعوتی خطوط ارسال فرمائے جن کے ذریعہ آپ نے انہیں خدائے واحد کی تابعداری اور انسانوں کی صحیح اخلاقی رہنمائی کی طرف متوجہ فرمایا اور ذمہ داری محسوس کرائی، اسی طرح شمالی شہنشاہیت کے شاہ روم کو بھی خط بھیجا، اور اسی طرح یمن وحبشہ کی طرف بھی پیغام دعوت ارسال فرمایا، اور اسی طرح دنیا کے تمام باثر علاقوں اور قوموں تک پیغام پہونچانے کی ذمہ داری پوری کی اور مزید آگے کے کام کی ذمہ داری اپنی امت پر ڈالی جن کو نسلاً بعد نسلٍ اس کا یرۃ العرب میں حق پھیل گیا تھا کچھ علاقوں کے ذمہ داروں نے کشمکش اور جنگ کا طریقہ اختیار کیا، آپ نے مسلمان مجاہدوں کے ذریعہ ان کا مقابلہ کر کے مطیع کر لیا، آپ (ﷺ) نے جزیرۃ العرب کے باہر کے حکمرانوں کو بھی دعوت قبول حق دی جس سے ان کے ملکوں تک حق کا پیغام پہونچا اور دعوت اسلام دور دور تک۔

پہونچی، آپ (ﷺ) نے دین حق کو پہونچانے کے لیے طاقت کا استعمال یا جنگ کو اسی وقت ضروری قرار دیا جب دشمن سے مقابلہ کی پرامن تدابیر ناکام ہوجاتی ہوں، اور طاقت کا استعمال اس اصول کے مطابق صرف بقدر ضرورت کیا، اسی لیے آپ کی جنگوں میں مقتولین کی تعداد حیرت انگیز طریقہ سے کم ہوئی۔

تبلیغ ودعوت میں جبر واکراہ نہیں

دین حق کے پیغام کے پہونچانے میں آپ (ﷺ) نے جبر واکراہ کی اجازت نہیں دی، صرف پیغام حق پہونچانے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں کے مقابلہ میں ضرورت پڑنے پر ہی طاقت کے استعمال کی تلقین کی اور اس کو جہاد قرار دیا اور حکم دیا کہ اس میں اپنے نفس کی خواہش یا کسی دنیاوی منفعت کو سبب نہ بننے دینا چاہئے ورنہ جہاد کی فضیلت حاصل نہ ہوگی، جہاد صرف اللہ کے حکم کی تعمیل میں یا اپنے جائز دفاع ہی میں صحیح قرار دیا، اسی طریقہ اور اصول پر آپ (ﷺ) کی حیات طیبہ کے بعد آپ (ﷺ) کے خلفاء نے عمل کیا، جس کے نتیجہ میں ایران وروم، مصر وسوڈان وحبشہ اور دوسرے علاقے بالآخر اس پیغام حق کے سامنے سرنگوں ہوگئے، اور اسلام کی دعوت توحید واطاعت کو کھلے دل سے سمجھنے کے بعد اردگرد کے سارے علاقوں کے باشندے بخوشی اور بطمانینت قلب اس کے سایہ میں آگئے، اور آپ (ﷺ) کے بعد پچاس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ دنیا کا سارا متمدن وباشعور علاقہ اسلام کے عقیدہ ودین کا تابعدار بن چکا تھا، اگرچہ اس سلسلہ میں مخالفین سے کئی جنگیں کرنی پڑیں، لیکن یہ جنگیں زوردستی دکھانے اور اپنے قبضہ کو پھیلانے کے جذبہ سے خالی تھیں، ان کا صرف یہ جذبہ تھا کہ حق کے پیغام کو پہونچانے میں جو رکاوٹ پیدا کرے اور مقابلہ پر آئے اس سے طاقت آزمائی کی جائے، اسی طرح اسلام پر عمل کرنے والوں پر ظلم وتعدی کیا جارہا ہو، اس کو دور کرنے کے لیے حسب ضرورت طاقت کا استعمال کیا جائے اور جس کا حکم قرآن میں اس طرح آیا ہے کہ:

”مَالَكُمْ لَاتُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ

نَصِیراً۔ " (النساء:۷۵)

(تم کیوں نہیں اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے جب کہ وہ مرد اور عورتیں اور لڑکے جنہیں کمزور سمجھ کر دبا رکھا گیا ہے کہہ رہے ہیں اے ہمارے پروردگار ہم کو اس بستی سے نکال، جس کے رہنے والے ظلم وزیادتی کرنے والے ہیں اور ہمارے لیے خاص اپنی طرف سے ہمدرد اور ساتھی بنا اور ہمارے لیے خاص اپنی طرف سے مددگار بنا)

ان کوششوں کا اصل مقصد صرف یہ تھا کہ اللہ کا بھیجا ہوا مکمل ضابطۂ حیات اور احکام شریعت لوگوں تک پہنچایا جاسکے تا کہ حجت پوری کی جاسکے، اور امت وسط اپنی ذمہ داری پوری کر سکے اور قیامت کے روز گواہی دے سکے کہ سب قوموں پر حجت پوری کی جاچکی تھی اور سارے انسانوں کے لیے دین حق کو جاننے اور سمجھنے کا وسیلہ مہیا کیا جاچکا تھا اور اب وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو دین حق جاننے کا موقع فراہم نہیں ہوا تھا، دین حق کو ہر طرف پہنچانے کے ذرائع اس امت کے رہنماؤں نے ہر طرح کے اختیار کیے، تعلیم کے راستہ سے، نصیحت وتربیت کے راستہ سے اپنی پاکیزہ زندگیوں کے نمونے سامنے لاکر اور دین حق کے جاننے کا ماحول مہیا کر کے، اور آخر میں مزاحمت کرنے والوں اور مزاحمت کے لیے طاقت استعمال کرنے والوں سے اسی طاقت اور مزاحمت کے ساتھ نبرد آزمائی کر کے تا کہ دین حق پر عمل کرنے والوں کے راستہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو روکا جاسکے اور حق کی بات سننے کی راہ ہموار کی جاسکے۔

دعوتی کاموں میں مشکلات کا سامنا

اس سلسلہ میں امت مسلمہ کے افراد نے ضرورت کے مطابق اپنی ذمہ داری پوری کی، جس کے راستہ میں ان کو سخت مزاحمتیں بھی پیش آئیں، اور مکروفریب کے حملوں سے بھی سابقہ پڑا، اور ظلم ودھاندلی کا بھی سامنا ہوا، جس کے واقعات پوری تاریخ اسلامی میں پھیلے ہوئے ہیں اور خاص طور پر یہود ونصاریٰ کے حلقوں سے کیے جاتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں امت مسلمہ کو نقصانات بھی ہوئے، اور مخالفانہ کوششوں اور سازشوں سے بہت سے ہدایت یافتہ انسان راستہ سے بھٹکے بھی، اور اس وقت بھی یہ صورت حال دنیا کے مختلف علاقوں میں

جاری ہے لیکن دین حق کے پہونچانے کا کام کرنے والے بھی صبر و ہمت سے اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور ان کو کامیابیاں بھی حاصل ہوتی رہتی ہیں۔

توسط واعتدال- امت کی اہم خصوصیت

اس امت کی تین اہم خصوصیات بتائی گئی ہیں، ان میں سے دو خصوصیات اس کا کمال اور اس کی برتری ہے اور تیسری خصوصیت اس کا اعتدال وتوسط ہے، جیسا کہ اوپر کے بیان میں گزر چکا، اس امت کا توسط واعتدال اس کے طریقۂ کار اور خصوصیات میں ہر جگہ پوری طرح نمایاں رہا ہے، حضور (ﷺ) کی حیات طیبہ سے لے کر اس امت کی تاریخ کے مختلف ادوار میں جن شخصیتوں نے اپنے اہم کردار کا ثبوت دیا ان سب میں توسط واعتدال کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں، ان میں نہ تو افراط رہا کہ بالکل رہبانیت اختیار کرلیں اور نہ تفریط رہی کہ دین ودنیا کے مباح وضروری امور کو نظر انداز کردیں، بلکہ عبادات ہوں یا زندگی کے دیگر معاملات سب میں کامل اعتدال اختیار کرتے تھے۔

اس امت میں جو شخصیتیں مختلف زمانوں میں ابھریں اور بلند مقام کی مستحق ہوئیں ان میں ذوق عبادت اور تقویٰ اپنے پورے معیار کے مطابق پایا گیا ہے، لیکن اس طرح تھا کہ زندگی کے جائز تقاضوں سے ان کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا تھا، اور عزیمت ومجاہدہ کی صفت کسی میں ظاہر ہوتی تو صرف ایک پہلو میں نہیں بلکہ مختلف پہلوؤں میں ظاہر ہوتی کہ ایک طرف عبادت میں کمال ہے تو دوسری طرف لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں پوری محبت وہمدردی اور تیسری طرف حسب ضرورت عمل وجہاد میں بھی شرکت۔ ان معیاری انسانوں کے متعلق صحیح کہا گیا کہ "رهباناً بالليل و فرساناً بالنهار" کہ رات میں دیکھو تو تارک الدنیا انسانوں کی طرح عبادت کرتے ہوئے نظر آئیں گے، اور دن میں دیکھو تو میدان زندگی کے شہ سوار اور فریضہ جہاد میں مشغول، معاصی سے سخت پرہیز کرنے والے اور اعتدال سے کام لینے والے ہوتے ہیں حضور (ﷺ) نے اعتدال وتوسط کی ترغیب دیتے ہوئے خود اپنی مثال دی فرمایا کہ میں رات کو عبادت میں، جاگتا بھی ہوں، اور آرام کے لیے سوتا بھی ہوں، روزے رکھتے ہوئے بھی دن گزارتا ہوں، اور بغیر روزہ کے بھی دن گزارتا ہوں اور ازدواجی زندگی بھی

اختیار کیے ہوئے ہوں پھر بھی تم سب سے زیادہ اللہ کا عبادت گزار بندہ ہوں، اور آپؐ نے تلقین فرمائی کہ "خیر الأمور أوسطها" بہتر باتیں وہ ہیں جو درمیانی ہیں، یعنی وہ باتیں جن میں نہ غلو سے کام لیا گیا ہو نہ کوتاہی سے کام لیا گیا ہو، اور وسطیت کے جو معنی بتائے گئے ہیں ان میں یہ خاص پہلو ہے، کہ ضرورت واہمیت کے لحاظ سے اور اسی کی مقدار کے مطابق عمل ہو۔ یہی وسطیت اور درمیانی طریقۂ عمل ہے۔

مکہ اور مدینہ میں قیام کے الگ الگ طریقے

انہی معنوں میں یہ بھی شمار کیا جاسکتا ہے کہ حضور (ﷺ) اور صحابہ کی مکی زندگی میں صرف صبر و برداشت اور قربانیوں سے کام لیا گیا اور حق کے حاملین نے صرف برداشت کیا، مقابلہ نہیں کیا اور یہ سلسلہ تیرہ سال تک رہا، وہاں نرمی کے ساتھ دعوت اور تربیت اخلاق کے طریقہ پر اکتفا کی گئی، اور مدینہ کی زندگی میں دس سال کو ان حضرات نے نظم وانتظام اور دشمن سے نبرد آزمائی اور دعوت کو دور تک پھیلانے کی کوشش میں گزارا اور آپ (ﷺ) نے اپنے صحابہ سے انہی طریقوں پر عمل کرایا اس طرح مکہ کی زندگی میں ہر طرح کی برداشت اور صبر وہمت کی مشق بھی ہوگئی اور حالات اور مقامی تقاضوں کے مطابق حکمت عملی پر بھی عمل کیا گیا، اور مدینہ کی زندگی دشمن کے مکر وفریب اور دھمکیوں کا منھ توڑ جواب دینے اور حسب ضرورت بہادری دکھانے میں صرف ہوئی اس طرح مسلمانوں کے طبقۂ اول نے جو طرز اپنایا وہ تمام طبقات کے لیے نمونہ ہے، اسی جامعیت اور وقت اور جگہ کے تقاضہ کے مطابق صبر و برداشت اور جرأت وہمت دونوں طرح کے طرز پر عمل کرتے ہوئے گزاری کہ نہ اس میں افراط تھا نہ تفریط بلکہ توازن اور توسط تھا، اسی کے ساتھ عملی اخلاق اور انفرادی زندگی میں احتیاط وتقویٰ، عمل صالح کی تلقین، معاشرہ کے اندر آپس کی خیر خواہی، کمزوریوں کی مدد، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، مصیبت زندگان کی مدد، مریضوں کی عیادت اور ہمدردی، ایک دوسرے کے ساتھ انکساری، آپس میں محبت، اخلاص ومروت، دشمنوں کے ساتھ جرأت، حق کے خلاف کام کرنے والوں سے سختی، حق کی حمایت میں عزم وہمت، انسانوں کی ہمدردی میں دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح جیسی صفات حضور (ﷺ) کے تربیت یافتہ حضرات میں ملتی ہیں،

آپ (ﷺ) نے انہیں باتوں کی اپنی امت کو تلقین فرمائی اور ان پر اپنے ساتھیوں کو عمل کرنے کی عادت ڈالوائی اور اس طرح ان اوصاف کو اپنے بعد آنے والے افراد امت کے لیے دین واخلاق کا اسوہ ونمونہ بنا دیا، جو بعد میں آنے والے منتخب مسلمان دینی رہنماؤں میں عموماً پائے جاتے رہے اور ان کا یہ طرۂ امتیاز رہا، اور یہی کردار قوموں کی رہنمائی اور ان کی نگرانی کے کام میں ان کا طرز عمل رہا۔

امت اسلامیہ کی عظیم ترین ذمہ داری

قوموں کی اصلاح کی فکر اور دین حق کی طرف ان کو مائل کرنے کی کوشش اس امت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا: "وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ" (سورۃ الانفال:۷۳) یعنی حق سے انکار کرنے والے ایک دوسرے کے معاون اور دوست ہیں، تم نے اگر اپنا کام نہیں کیا تو زمین پر بہکانے کا اور برائی کے لیے لبھانے کا ایک سلسلہ ہوگا، اور بڑا بگاڑ پیدا ہو جائے گا، اس لیے ساری دنیا کی اصلاح اور درستگی کی کوشش ان مسلمانوں کی ذمہ داری بنا دی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ اس عمل کے سلسلہ میں دنیا کے مختلف حصوں سے ان کا رابطہ قائم ہو جانے کے بعد وہ دین واخلاق کے تعلق سے ساری دنیا کے عمل اور رد عمل سے واقف ہو رہے ہیں اور اسی بنا پر وہ ان کے بارے میں قیامت کے روز صحیح گواہی دینے والے ثابت ہوں گے، ان کی یہ امتیازی شان جو اللہ کی طرف سے ان کو دی گئی ہے، اور اس کو وسطیت سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کے لیے محض تمغۂ امتیاز نہیں بلکہ یہ ایک عظیم ذمہ داری ہے، ان کی یہ عظیم ذمہ داری جس میں تمام انسانوں کی خیر خواہی اور ان کے متعلق عند اللہ گواہی کا فریضہ ادا کرنا ہے۔

ایمان وعمل صالح

اس کام کے لیے خود اس امت کو اپنا کردار اور عمل اسی معیار کا بنانا ضروری رہا، جو اس بلند مقام کے لائق قرار پا سکے، اس لیے جہاں یہ ذکر ہے کہ تم اچھی باتوں کی ہدایت کرتے ہو اور بری باتوں سے منع کرتے ہو وہاں یہ ذکر بھی آیا "وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" کہ تم حق کو

دل سے مانتے ہوئے ایمانی زندگی اختیار کرتے ہو۔

فرض منصبی کی ادائیگی

اس امت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اس امت میں مسلسل اوراس کے مختلف علاقوں میں ایسی ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں کہ جوایمان وعزیمت کے معیاری کردار کے حامل رہی ہیں، اور جب جب انسانی زندگی میں دینی واخلاقی بگاڑ پھیلا ہے اس امت میں سے کوئی شخصیت قدآور بن کر سامنے آگئی، اور ایمان وعزیمت کی خصوصیت کے ساتھ انسانوں کی اخلاقی ومذہبی بلکہ انسانی وفکری رہنمائی واصلاح کا ایسا زبردست کام انجام دیا کہ جس کی مثال صرف نبیوں کے یہاں ملتی ہے۔ وہ نبی تو نہ تھے کیونکہ نبوت آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوچکی ہے، لیکن انہوں نے اپنے کردار اور سیرت سے نبیوں کا نمونہ پیش کیا، ان کو خدا کی طرف سے اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے لیے نبیوں کے طریقہ کی توفیق کی دعا کریں اور یہ دعا ان کو سورہ فاتحہ میں پڑھنا بتایا گیا ہے جو نمازوں کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے کہ اے اللہ ہم کو سیدھی راہ عطا فرمایا ایسی راہ جو ان لوگوں کی ہے جن پر تیرا انعام ہوا، اور ایک جگہ یہ دعا بتائی گئی "وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَاماً" کہ ہم کو پرہیزگاروں کا امام ومقتدیٰ بنا۔

چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پھر ان کے بعد متعدد تابعین، پھر تبع تابعین، جن میں نمایاں طور پر حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، عمر بن عبدالعزیزؒ، پھر بعد کے لوگوں میں ائمہ حدیث وائمہ فقہ، ائمہ تزکیہ تصوف، عظیم غازی ومجاہد جنہوں نے اسلام کے صحیح اصول اور مسلک کے مطابق جہاد کی مثالیں قائم کیں، خدمت علم کے میدان کے عظیم شہسوار اور اس طرح کی دوسری عظیم تاریخی شخصیتیں گذشتہ تاریخ اسلام میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

دعوت حق کی عالمی کوششیں

امت کے ان کارگزاروں نے خدائے واحد کی بندگی اور اس کی بھیجی ہوئی شریعت کے پیغام کو دور دور تک پہونچایا، انسانی آبادی کا کوئی اہم علاقہ ایسا نہیں بچا جہاں ان میں

سے کسی نہ کسی کے قدم نہ پہونچے ہوں، اور جہاں یہ کہنے کا موقع رہ گیا ہو کہ ہم تک کوئی پیغام نہیں لایا، اور ہمارے یہاں کوئی بتانے والا نہیں پہونچا اس امت کی یہ ذمہ داری ان پر رکھی گئی کہ اپنے کو اس پیغام خداوندی پر عمل کے مطابق ڈھالتے ہوئے دوسروں تک وہ پیغام پہونچائیں اور اس پر نظر رکھیں کہ لوگوں نے کہاں تک مانا، اور یہی منصب اور کام قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر ہے:

"وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (آل عمران:۱۰۴)

(تم میں ایک جماعت (امت) ایسی ضرور رہنی چاہیے جو اچھائیوں کا حکم دے اور برائیوں سے منع کرے، اور یہی لوگ اصل کامیابی والے ہیں)۔

اس آیت میں اس بات کی گنجائش رہ گئی ہے کہ امت کے معتد بہ افراد اگر اس ذمہ داری کو انجام دے رہے ہیں تو وہ فریضہ انجام پا رہا ہے اور یہ فریضہ انجام دینے والے ہی لوگ کامیاب ہیں، اور یہ فطری بات بھی ہے کہ امت کے ہر ہر فرد پر ذمہ داری نہ ہو کیونکہ امت کے ہر فرد میں بشری وجسمانی صلاحیتوں میں کمی رہنے کی وجہ سے اس عظیم کام کی لیاقت کا ہونا ضروری نہیں ہے، لیکن ایک خاص تعداد میں ایسے لوگوں کا ہونا ضروری ہے، تاکہ ہر کام انجام پائے ظاہر ہے کہ یہی لوگ نمایاں لوگ قرار پائیں گے، ہمیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ ہی سے اس کی مثالیں ملتی ہیں، انہوں نے جہاں صرف محبت اور حسن اخلاق سے یہ کام انجام پاتا دیکھا وہاں اس طرح انجام دیا، اور جہاں ہمت وجرأت اور دفاع کی ضرورت پڑی وہاں اس طرح کیا، مختلف علاقوں میں ان کی جو فوج کشی ہوئی وہ برائے جنگ وبرائے قتال نہیں تھی، بلکہ اوّلاً ان کے رسول کی طرف سے پھر ان کی طرف سے تمام اہم علاقوں کی طرف پیام حق بھیجا گیا جو ان کے نبی حضرت محمد (ﷺ) کے خطوط کی شکل میں تھا ان میں آپ (ﷺ) نے اس عہد کے اہم علاقوں کے سربراہوں کو دعوت دی کہ وہ خدا کی بندگی اور اس کے دیئے ہوئے صحیح راستہ کو اختیار کریں اور اس کی دعوت کو قبول کریں، اور قبول نہ کرنا چاہیں تو اس پیغام کو عوام تک پہونچانے میں رکاوٹ نہ ڈالیں تاکہ حق بات لوگوں تک پہونچ سکے، پھر ان کی مرضی پر منحصر

ہے، مانیں یا نہ مانیں کوئی زبردستی نہیں، کیونکہ اسلام میں مذہب کو زبردستی منوانا منع ہے، اگر حق بات پہونچانے سے روکا جائے تو پھر مسلمانوں کو سخت معاملہ کرنے کا حکم ہے، چنانچہ صحابہ کرام نے ان نہ ماننے والوں کے علاقوں کی طرف مجاہدوں کی جماعتیں بھیجیں کہ وہ ان کو دو باتوں میں ایک بات قبول کرنے پر آمادہ کریں۔

جہاد کی ضرورت اور اس کے اسباب

البتہ ان میں سے جو دونوں باتوں کو نہ مانے، اور دین حق کے داعیوں کی پر امن کوشش میں رکاوٹ ڈالے، اور پیغام حق کو قبول کر لینے والوں کو پریشان کرے اور حق پر عمل نہ کرنے دے اور ان کا طاقت وزوردستی سے مقابلہ کرے تو ان سے اہل حق کو مقابلہ کر کے مذکورہ دو پر امن باتوں میں سے کسی ایک بات پر مجبور کیا جائے گا یعنی وہ یا تو حق کو قبول کر لیں اور یا حق کے پیغام میں رکاوٹ نہ ڈالیں، اگر دونوں میں سے کوئی بات نہ مانیں گے تو ان سے جہاد کیا جائے گا اور ایک بھی بات مان لیں گے تو ان سے کوئی لڑائی نہیں، یہی وہ اصول اور طریقہ ہے جس کے مطابق جنگ کرنے کو اصلاً ''جہاد'' کہتے ہیں اور یہ امیر کے تحت کیا جاتا ہے جس کا انتخاب اسلامی طریقہ سے کیا جاتا ہے۔

جہاد کے دائرے میں بعض دوسری شکلیں مثلاً ظلم کو دور کرنے، اپنے اوپر حملہ کو پسپا کرنے کو بھی شامل کیا گیا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اپنی خواہش یا محض ذاتی عداوت کی بناء پر نہیں بلکہ محض اللہ کے لیے جنگ کرنا ہوتا ہے، اس میں جان ومال کی قربانی دینا ہوتی ہے، اور اسلامی اصطلاح میں اللہ کے حکم اور اس کی رضا کے لیے جو جدوجہد کی جائے خواہ پُر امن ہو اور خواہ جنگ کی صورت میں ہو جہاد کے زمرے میں شمار ہوتی ہے دراصل دعوت اور اصلاح حال اور خدائے واحد کی بندگی اختیار کرنے کے لیے اور اس کے تقاضے کے مطابق جدوجہد مقصود ہوتی ہے، چنانچہ جنگ بھی اسی مقصد کے حصول کے لیے اور پر امن ذرائع کے ناکام ہو جانے کی صورت میں رکھی گئی ہے، اور مسلمانوں نے ہمیشہ اس کی پابندی کی ہے، بلکہ اسلامی تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ جہاد کی مذکورہ بالا شرطوں

میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے میں کوتاہی ہو جانے پر مسلمانوں کے امیر نے مفتوحہ علاقہ کو خالی کردینے کا حکم دیدیا، اور مسلمان فوجیں مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر واپس آ گئیں اور علاقے کو اس کے پہلے حاکموں کے حوالہ کردیا، اور پھر وہ دو پر امن صورتیں دوبارہ ان کے سامنے رکھیں، اس کا اثر یہ پڑا کہ انہوں نے بخوشی دوصورتوں میں سے ایک صورت قبول کرلی، اور جنگ کی نوبت نہیں آئی، اور ایسا واقعہ بھی پیش آیا کہ جہاد کی نوبت آنے پر فتح کردہ علاقے کے سابق حاکم نے یہ کہا کہ ہم خدائے واحد کی بندگی اور اس کے مطابق زندگی اختیار کرنے کا خود انتظام کریں گے۔ تو ان کو فاتح نے حکومت واپس کردی اور علاقہ چھوڑ کر واپس آ گئے اور یہ کہا کہ ہمارا مقصد اصلاً خود حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ اللہ کے دین کو قائم کرنا ہے، وہ تم کرو یا ہم کریں، برابر ہے، تم ہی کرو، لیکن تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وقتاً فوقتاً مختلف مسلمان حاکموں نے اسلام کے مقرر کردہ اصول سے ہٹ کر اپنی ذات کے لیے اور اقتدار کی خواہش میں جنگ کی، اللہ کے دین کے قائم کرنے اور اس کے لیے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق نہیں کی، ایسی جنگ جہاد نہیں ہے خواہ اس کو جہاد کا نام دیا گیا ہو، اسلامی شریعت میں جہاد وہ جنگ ہے جو اسلامی اصول کے مطابق اور اپنی خواہش کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے لڑی جائے۔ ایسی جنگ جو اسلام کے مقررہ اصول کے مطابق اور خدا کے لیے نہ لڑی جائے تو وہ جس مقصد کے لیے لڑی جاتی ہے اسی مقصد کے لیے کہلائے گی، اسلام میں غلبہ و فتح حاصل کرنے کا مقصد قرآن مجید کی رو سے اس طرح بتایا گیا ہے:

"اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَآتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ" (سورۃ الحج:۴۱)

(یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین پر اقتدار دیدیں تو نماز کے عمل کو قائم کریں گے اور (غریبوں کی مالی مدد) زکوۃ دیں گے اور نیکیوں کی دعوت دیں گے اور برائیوں سے منع کریں گے اور تمام معاملات کے نتائج خدا کے ہاتھ میں ہیں۔)

جہاں تک جنگ کے عمل کا تعلق ہے تو وہ انسانوں کا ایک ایسا عمل ہے جو نیتوں

اور مقاصد کے فرق کے لحاظ سے دنیا میں مختلف مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے، اور عموماً اپنا اقتدار بڑھانے کے لیے کیا جاتا ہے لہٰذا جب وہ کسی اعلیٰ غرض سے کیا جاتا ہے تو حقیقت حال سے ناواقف لوگوں کی نظر میں جنگ کرنے والے کی جاہ طلبی اور ذاتی اغراض کے لیے اقتدار طلبی ہی سمجھا جاتا ہے، خواہ وہ خلوصِ نیت سے اور انسانیت کے فائدہ کے لیے ہو، لیکن نیتوں کا حال اللہ کو معلوم ہے، اور اللہ کے یہاں نیتوں کے اعتبار ہی سے معاملہ ہوگا۔

حضو(ﷺ) نے ایک موقع پر ایک سوال کرنے والے کے جواب میں وضاحت کی، جس نے یہ سوال کیا تھا کہ بعض لوگ بہادری دکھانے کے لیے اور بعض لوگ جاہ وسلطنت کے حصول کے لیے جنگ کرتے ہیں، ان میں کون سی جنگ اللہ کے راستہ میں ہوگی حضور (ﷺ) نے فرمایا کہ جو جنگ صرف اس لیے لڑی جائے کہ اللہ کی بات غالب ہو وہی اللہ کے راستے میں شمار کی جائے گی، اس طرح اسلام میں جنگ اسی وقت جہاد بنتی ہے جب وہ اللہ کی بات غالب کرنے کے لیے لڑی جائے اور اس کا شرعی طریقہ وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا، اور اسی کے ساتھ جو شخص مظلوم ہو وہ اپنے اوپر ظلم کو روکنے کے لیے، اور کوئی صاحب حق جس کا حق زبردستی چھینا جارہا ہو اور جس کے ساتھ زیادتی ہوئی وہ اپنی زیادتی کا بدلہ لینا چاہتا ہو، ان سب کو بھی اپنے حق وانصاف کے لیے لڑنا اور مقابلہ کرنا جائز قرار دیا گیا ہے، لیکن صرف اسی مقدار میں جتنی مقدار ضروری ہے۔

اسلام میں جہاد نفس کشی اور قربانی ہے

لیکن اسلام میں جہاد کا عمل جس میں صرف اللہ کے حکم کی تعمیل پیش نظر ہوتی ہے بہادری، فائدہ یا نفس کی خواہش پیش نظر نہیں ہوتی ایک مشقت کا کام اور ایک قربانی ہے اور اپنے کو خطرہ میں ڈالنا ہے، یہ الگ بات ہے کہ خطرہ میں ڈالنے کے بعد نتیجہ اچھا نکلے اور ذاتی فائدہ بھی ہو، لیکن مجاہد اپنے نفس کے فائدہ اور محض دنیاوی غرض کو اپنا مقصد نہیں بنا سکتا، اس طرح اسلام میں جہاد ایک نفس کشی اور ذاتی غرض کی قربانی کا عمل ہے، اور سب سے مشکل عمل ہے، اسی لیے اس کی بڑی فضیلت بتائی گئی ہے کہ آدمی اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی جذبہ سے نہیں

بلکہ صرف اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال رہا ہے، یہ بڑے ثواب کا عمل قرار دیا گیا ہے، اصل فریضہ انسانیت کی اصلاح و درستگی کی کوشش ہے، بہرحال خدا کی بندگی اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے طریقہ کو جس کو آخری نبی محمد (ﷺ) نے خدا تعالیٰ کی وحی کی بنیاد پر اور آخری آسمانی کتاب کے ذریعہ بتایا ہے، اس طریقہ کو پہونچانے اور پھیلانے کے لیے کوشش اور جدوجہد کے جو مناسب طریقے ہیں ان کو اختیار کرنے کی ذمہ داری اس امت پر ڈالی گئی ہے، تاکہ انسان اپنے اولین طریقہ پر چلے جو اس کے مورث حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں جاری تھا جس میں صرف ایک خدائے واحد کی بندگی کے علاوہ کسی دوسرے کی بندگی نہ تھی اس کے ساتھ ساتھ اخلاق و کردار کی درستی اور خدا کی طرف سے وقتاً فوقتاً بھیجے جانے والے نبیوں کی پیروی تھی یہی دین حق ہے جو حضرت محمد (ﷺ) پر مکمل کر دیا گیا، اب قیامت تک انسان کے لیے وہی فلاح کا راستہ رہے گا، اس کو اپنانے اور رواج دینے کی ذمہ داری حضور (ﷺ) کی امت پر ڈالی گئی ہے، اس طریقۂ حق کو دوسروں تک پہونچانے کے مختلف ذرائع ہیں ان میں سے ایک ذریعہ علم و ابلاغ کا ہے، دوسرا محبت و ہمدردی کا ہے، اور تیسرا ذریعہ راہ حق میں رکاوٹ ڈالنے والوں اور روکنے والوں سے مقابلہ کر کے اللہ کی مرضیات کا ان کو تابع بنانے یا مصالحت پر آمادہ کرنے کا ہے۔

مقابلہ کے ذریعہ میں قتال یعنی جنگ بھی آتا ہے، اور اصول کے مطابق ہو تو جہاد کہلاتا ہے، حدیث شریف میں مختصر انداز میں اس کا حکم یوں دیا گیا ہے کہ "من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه، فان لم يستطع فبقلبه و ذلك أضعف الايمان" (۱) تم میں سے جو کوئی شخص نامناسب اور بری بات دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے، ہاتھ سے نہ بدل سکے تو زبان سے کرے (کہہ سن کر منع کر کے یا سمجھا کر یہ تبدیلی لائے) اور اگر اس ذریعہ سے بھی نہ کر سکتا ہو (اس کو خطرہ ہو اور الٹا اثر پڑتا ہو) تو اپنے دل اور خیال و فکر کا ذریعہ اپنائے (دل سے اس کو برا سمجھے اور اس کے بدلنے کی دل میں خواہش رکھے) آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے (ایمان کا کم سے کم

(۱) مسلم: کتاب الایمان باب کون النهی عن المنكر من الایمان وان الایمان یزید وینقص..الخ

تقاضا یہ ہے کہ بری بات کو برا سمجھے اور اس کو بدلنے کی خواہش رکھے)

مذہب کے ماننے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا

بہر حال اس امت کے افراد کی یہ ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ وہ حق کو پہونچائیں، اور باطل کو روکیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا گیا ہے کہ "لااکراہ فی الدین" کہ دین حق کو بتانے اور اس کو منوانے میں جبر واکراہ نہیں، لہٰذا کسی غیر مسلم کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جاسکتا، ہاں جو دین حق کی بات پہونچانے میں رکاوٹ ڈالیں اور زبردستی روکنے والے ہوں تو ان سے مقابلہ کیا جائے گا، اور یہ بات مجبوراً قتال (لڑائی) تک پہونچادیتی ہے، مگر رکاوٹ نہ ڈالنے والے اور مقابلہ نہ کرنے والوں سے جبر وزبردستی نہیں کی جاسکتی، اس کی مثالیں برابر مسلمانوں کی جنگوں کی تاریخ میں ملتی ہیں، جب بھی صلح کی پیش کش دوسری طرف سے ہوئی تو مسلمانوں نے جنگ ترک کردی۔

حضور (ﷺ) کی حیات طیبہ جو تمام مسلمانوں کے لیے اسوہ اور قابلِ پیروی زندگی ہے پوری دعوت حق کے کام میں اور حق کی ترویج ونفاذ میں گزری، نبوت کی ذمہ داری ملنے پر ۱۳ رسال تکلیفیں اٹھا کر اور عداوت وایذارسانی برداشت کرکے یہ کام انجام دیا، پھر مدینہ منورہ ہجرت کرکے کام میں وسعت کی گنجائش دیکھی تو کام کو مزید قوت اور وسعت کے ساتھ انجام دیا، اور پھر اسی طریقہ کو آپ نے اپنی امت کے لیے طے فرمادیا اولاً اپنے قریبی علاقوں میں پیغام پہونچایا پھر دور کے علاقوں میں پیغام پہونچایا، اردگرد کے حکمرانوں کو خطوط ارسال کیے جن میں فرمایا کہ خدائے واحد کی تابع داری اور دین حق کو قبول کریں، تو اس میں ہی خیر وصلاح ہے اور یہی راہ حق ہے، تو جب ان کی طرف سے انکار بلکہ سخت اور نامناسب جواب آئے تو آپ (ﷺ) نے طاقت کے ساتھ آگے بڑھنے کا اور جہاد کا ارادہ فرمایا، جو احتیاط اور مقرر شرائط کے ساتھ آپ اور آپ کے خلفاء نے آپ کے بعد جاری رکھا، اس طرح پر جزیرۃ العرب میں اور قرب وجوار کے تمام ممالک میں حق کی آواز پہونچادینے کی راہ نکالی جس نے حق کی بات کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے پر رضامندی نہیں ظاہر کی اس پر جبر

نہیں کیا، لیکن حق کی آواز کو روکنے والوں سے پوری جنگ کی، اوراس میں کوئی کمزوری نہیں دکھائی اسی مقصد کے لیے مسلمانوں پر قوموں کے احتساب اوران کے حالات کا جائزہ لے کر ان کو پیغام پہونچانے اوران تک حق کی آواز کو پہونچانے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے، اوران کو اس پر گواہ بنایا گیا ہے۔

ضروری وسائل وصلاحیت

دین حق کو پہنچانے کے لیے اورامتوں پر گواہ بننے کی ذمہ داری پوری کرنے اور مفوضہ ذمہ داری کے جو تقاضے ہوتے ہیں ان کی صلاحیت کارکردگی حاصل کرنے کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر عائد کی گئی ہے۔ اس میں ایک تو علمی اور معلوماتی صلاحیت ہے جس کے ذریعہ انسانوں کی اخلاقی وفکری رہنمائی کا کام انجام دے سکے، دوسرے کردار وعمل کے لحاظ سے وہ نمونہ پیش کرسکے جو اس کے امت وسط ہونے کے مقام کے شایان شان ہو اور جس میں خدائے واحد کی بندگی کا معیاری عمل ہو، اور تیسرے انسانی معاشرے میں حق وانصاف اور خیروصلاح کی قدروں کو رائج کرنے کی کوشش ہو، چنانچہ ان تینوں حیثیتوں سے امت مسلمہ نے بڑا فریضہ انجام دیا ہے اور بڑی ذمہ داری پوری کی ہے اسی طرح علم کے میدان میں بھی غیر معمولی صلاحیت اور کردار کا ثبوت دیا ہے، چنانچہ وہ کئی صدی تک دیگر قوموں کی استاد رہی اور بڑی حد تک امت وسط ہونے کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کو پورا کیا۔

امت اسلامیہ کی عظمت

اور

اس کی امتیازی خصوصیات

امت اسلامیہ جس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے مقام وسطیت یعنی اعتدال عظمت وکمال کا مقام عطا کیا گیا ہے اپنے اس مقام کی بناء پر وہ انسانی زندگی کے تمام تعمیری ومفید پہلوؤں میں امتیاز اور قائدانہ کارکردگی کی ذمہ دار بنائی گئی ہے، اوراس پر یہ ذمہ داری بحیثیت جماعت وامت کے ڈالی گئی ہے، اس ذمہ داری کے ہر ہر پہلو میں قائدانہ کردار کی انجام دہی امت کے ہر ہر فرد پر لازم نہیں کی گئی ہے، کیونکہ عملی زندگی میں یہ ممکن نہیں ہے کہ مختلف افراد کے مابین صلاحیت کار اور طاقت عمل کا فرق ملحوظ رکھے بغیر ہر عظیم کام ہر فرد سے لیا جائے، لیکن اگر امت کے افراد کی ایک معتد بہ تعداد امت پر عائد ذمہ داری کو اپنی اپنی صلاحیت کار کے فرق سے ادا کرتی ہے تو یہ پوری امت کی طرف سے اس پر عائد شدہ فرض کی ادائیگی شمار ہوتی ہے، اوراس طرح امت پر عائد فریضہ انجام پا جاتا ہے، اس کی اجازت قرآن مجید کی اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے کہ:

"وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ" (آل عمران ۱۰۴)

(تم لوگوں میں سے ایک امت (یعنی افراد کا ایک مجموعہ) ایسا ہونا چاہیے

جو اچھی بات کی طرف بلاتا ہو، اور بھلائی و نیکی کی ہدایت کرتا ہو اور برائی سے منع کرتا ہو)۔

لیکن اگر اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لیے امت کے معتد بہ افراد بھی نہ اٹھیں تو پوری امت خطا کار قرار پائے گی اور ادائیگی فرض میں کوتاہی پر جواب دہ اور ماخوذ ہوگی۔

امت اسلامیہ کے امت وسط ہونے کا عملی اظہار ایک تو اس کے "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کی ذمہ داری پوری کرنے سے ہوتا ہے جو اس کا بنیادی فریضہ قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے عظیم اور باکمال ہونے کی علامت انسانی زندگی کے تمام تعمیری اور مفید پہلوؤں میں اس کے کمال کے اظہار اور قائدانہ کردار کی انجام دہی میں نظر آتی ہے، جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اس امت کے مختلف طبقات نے انجام دیا ہے۔

چنانچہ ہم اس امت وسط کے ان افراد کی تاریخ پر جب نظر ڈالتے ہیں جنھوں نے مختلف پہلوؤں میں الگ الگ اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے کو مفوضہ ذمہ داریوں میں لگایا، اور اپنی اپنی جگہ پوری امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا، تو ہم کو ان کے کارنامے، ان کے اختیار کردہ دائرہ عمل میں نمایاں اور تاریخ ساز نظر آتے ہیں، خواہ وہ دینی و اخلاقی دعوت ورہنمائی کا ہو، یا علم ودانش کی ترقی واشاعت کا ہو، خواہ خدمت خلق اور اصلاح اخلاق کا یا حکومت وسیاست کے کام کا، سب دائروں میں اس امت کی عظیم شخصیتیں نظر آتی ہیں اور ان کے وسیع اور دوررس کام تاریخ میں ثبت ملتے ہیں۔ انہی کے نتیجہ میں انسانیت کی کشتی باوجود بہت سے انسانوں کے تخریبی کاموں کے تلاطم میں ڈوبنے سے محفوظ رہی۔

امت اسلامیہ کے آغاز کے وقت دنیا کی حالت زار

اس امت کے آغاز کے وقت جو اس کے نبی محمد (ﷺ) کی بعثت سے ہوا تھا، دنیا بگاڑ کے اس مرحلے میں پہونچ چکی تھی کہ اس کے نتیجہ میں انسانیت کی عظیم تباہی کا امکان پیدا ہوگیا تھا، انسانوں میں اپنی خواہشات وذاتی اغراض کے لیے ایسی تخریب پسندی وشرانگیزی پیدا ہوگئی تھی جو جانوروں کے ریوڑوں میں بھی کم ہوتی ہے جس میں ایک طاقتور وصاحب

ثروت انسان دوسرے کمزور غریب انسان کو جانور سے بدتر سمجھتا تھا، عزت و بے عزتی کا معیار رنگ وخاندان اور دولت وحکومت سے بنتا تھا، نیکی وبدی کا شمار بھی طاقت و دولت، کمزوری اور غربت کے اعتبار سے ہوتا تھا۔

مساواتِ انسانی کا پہلا منشور اور اس کا عملی اجراء

ان حالات میں خاتم الرسل حضرت محمد (ﷺ) نے کمزور انسانوں کی مدد، انسانی مساوات اور انصاف کی تلقین کا کام انجام دیا، آپ نے لاکھوں کے مجمع میں عرفات میں اعلان فرمایا:

"لا فضل لعربی علی عجمی ولالعجمی علی عربی ولالأبیض علی أسود ولالأسود علی أبیض الا بالتقویٰ کلکلم من آدم وآدم من تراب"۔(۱)

(کسی عربی کو عجمی یا کسی عجمی کو عربی پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر تقویٰ کے علاوہ کسی اور وجہ سے فضیلت نہیں ہے، تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے پیدا کیے گئے تھے)۔

اور اعلان فرمایا کہ آج حج کا یہ قابلِ احترام مہینہ اور یہ قابل احترام شہر ہے، جس طرح ان کا احترام اور تقدس ہے، اسی طرح تم میں سے ہر ایک کی جان اور ہر ایک کا مال اور ہر ایک کی عزت دوسرے کے لیے قابل احترام اور قابل عزت ہے۔ یہ اعلان انسان کے انسانی حقوق اور انسانوں کی آپس کی مساوات کا پہلا زبردست اعلان تھا۔ جو دنیا نے اس وقت تک اس تاکید اور قوت کے ساتھ نہیں سنا تھا، اب اس کے چودہ سو سال بعد بیسویں صدی میں اقوام متحدہ نے اپنے چارٹر میں انسانی حقوق کا جو اعلان کیا، وہ زیادہ سے زیادہ اس کی بازگشت کہا جا سکتا ہے، آپ (ﷺ) کا یہ اعلان صرف اعلان ہی نہ تھا، بلکہ اپنے ماننے والوں کے لیے حکم تھا، جس کو آپ (ﷺ) نے خود بھی اپنے طرز عمل سے کر کے دکھایا، اور اپنے

---

(۱) مسند احمد: حدیث نمبر ۲۳۸۸۵

ماننے والوں کواسی پر چلایا، چنانچہ جن کواپنا ساتھی اور رفیق کار بنایا، ان میں عالی خاندان عرب اور معمولی حیثیت رکھنے والے اہل وطن بھی تھے، ان ہی کے ساتھ دوسری قوموں کے کالے گورے اور مختلف نسل کے افراد بھی تھے، آپ (ﷺ) نے سب کے ساتھ مساویانہ معاملہ رکھا، ان میں سفید نسل رومیوں کے فرد صہیب رومیؓ، عجمی ایرانی نسل کے فرد حضرت سلمان فارسیؓ، کالے حبشیوں کے فرد حضرت بلال حبشیؓ اور عربوں کے مختلف طبقات کے افراد تھے، آپ (ﷺ) نے ان کو صرف رفقائے کار ہی نہیں بنایا، بلکہ مقرب اور عزیز ساتھی کا مقام دیا، اور آپ (ﷺ) کا معاملہ باوجود اس کے کہ آپ (ﷺ) ان سب کے سربراہ تھے، سب کے ساتھ برابری کا اور بالکل بھائیوں جیسا اور انتہائی خوش اخلاقی کا تھا۔

غلاموں کے ساتھ مساوات

صرف انہی کے ساتھ نہیں بلکہ آپ (ﷺ) کا معاملہ غلاموں کے ساتھ بھی بھائیوں جیسا تھا، آپ (ﷺ) کو آپ (ﷺ) کی اہلیہ حضرت خدیجہؓ کی طرف سے زیدؓ بن حارثہ بطور غلام ملے تھے، آپ (ﷺ) نے ان کو آزاد کر کے بیٹے کی طرح معاملہ کیا اور متبنّٰی کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھا، حتی کہ ان کے والد جب تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہونچے تو آپ (ﷺ) نے ان کو اجازت دی کہ وہ اپنے بیٹے کو لے جاسکتے ہیں، لیکن ان کے بیٹے نے غلامی کی شہرت کے باوجود یہ کہا کہ یہاں ان کو زیادہ آرام اور شفقت حاصل ہے، اور جانے کے لیے تیار نہ ہوئے، آپ (ﷺ) نے ان کے ساتھ برابری کا مزید یہ سلوک کیا کہ اپنی ایک عزیز کو ان کی زوجیت میں دیدیا، اس طریقہ سے گویا ان کو اپنے خاندان کا جزء بنالیا، آپ (ﷺ) کی عزیزہ کو جب آپ (ﷺ) کے یہ آزادہ کردہ غلام زید بن حارثہ اپنی زوجیت میں قائم نہ رکھ سکے اور طلاق دیدی، تو آپ (ﷺ) کی عزیزہ کی جو اس میں بے توقیری ہوئی، اس پر آپ (ﷺ) نے زید بن حارثہؓ سے کوئی شکوہ نہ کیا، البتہ آپ (ﷺ) نے اپنی عزیزہ کی دلداری کے لیے ان کو اپنی زوجیت کی عزت عطا فرمادی، یہ وہ برابری اور مساوات کی مثال ہے جس کو تاریخ انسانی پیش نہیں کرسکتی، پھر آپ (ﷺ) نے اسی راہ پر اپنے رفقاء کار اور متبعین کو بھی

چلایا، چنانچہ صحابہ کرامؓ میں بھی اس سے ملتی جلتی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، حضرت عمرؓ کی مثال گذشتہ باب میں گزر چکی ہے کہ وہ وسیع الأطراف اور برسر اقتدار امت اسلامیہ کے حاکم کی حیثیت سے جب بیت المقدس گئے تو انہوں نے اپنے غلام جن کو وہ معاونت کے لیے ساتھ لے گئے تھے، ان کے ساتھ راستہ میں بالکل برابری کا سلوک کیا، اور جب شہر میں داخل ہورہے تھے تو ان کے غلام سواری پر تھے اور خود پیدل کہ دونوں باری باری سواری پر بیٹھتے آئے تھے، اتفاق سے بیت المقدس میں داخل ہوتے وقت خادم کی باری تھی، تو اس کی پرواہ کیے بغیر کہ لوگ کیا کہیں گے ان کو سواری پر بٹھائے رکھا اور خود پیدل رہے۔

صحابہ کرامؓ کے علاوہ بعد کی مسلمان حکومتوں میں بھی غلاموں کے ساتھ ایسا اعلیٰ سلوک کرنے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، جن میں یہ مثال قابل ذکر ہے کہ اگر غلام سربراہ بن گیا ہے تو سب نے اس کو حاکم تسلیم کرلیا اور اس کو اپنا بادشاہ سمجھا، اس کی مثالیں شام ومصر کی حکومتوں میں اور ہندوستان کی مسلم حکومتوں میں ملتی ہیں۔

اسلام میں غلامی کی حیثیت

رہا غلاموں کو غلام باقی رکھنے کا مسئلہ تو جنگی مصلحت سے گذشتہ زمانہ میں غلام بنانے کا جورواج تھا، وہ اسلامی حکومت کو بھی اپنے کو مصیبت وخطرہ سے بچانے کے لیے باقی رکھنا پڑا تھا، لیکن نبی آخرالزماںؐ نے ایک تو غلام بنانے کے طریقوں کو محدود اور صرف جنگ کی مصلحت کے ساتھ مربوط کیا دوسرے غلاموں کے ساتھ مساوی طرز عمل اپنانے کی تاکید کرتے ہوئے مختلف طریقوں سے انہیں آزاد کیے جانے کی بھی متعدد شکلیں مقرر فرمائیں مثلاً رضائے الٰہی کی طلب کے لیے اور بعض گناہوں کی تلافی کے لیے کفارہ کے طور پر غلاموں کو آزاد کرنے کا طریقہ مقرر فرمایا، پھر مزید یہ طریقہ بھی طے فرمایا کہ غلام فدیہ دے کر اپنے کو آزاد کراسکتا ہے، ان صورتوں کے بعد بھی جو غلام رہ جائے اس کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کرنے کی تلقین فرمائی، حد یہ ہے کہ اپنی وفات کے وقت آخری وصیت میں بار بار جو دو باتیں فرمائیں، ان میں ایک نماز کی تاکید اور دوسرے غلاموں سے اچھا سلوک کرنے کی تلقین تھی، اس لیے مسلمانوں کی سوسائٹی میں غلام

کو اجرت پر مقرر کئے ہوئے کارکن اور ایک خادم یا مددگار شخص سے کم درجہ نہیں دیا جاتا تھا، نیز ان کے آزاد ہونے کی صورتیں برابر پیدا ہوتی رہتی تھیں۔

انصاف اور مظلوم کی مدد

آپ (ﷺ) کی مساوات حقوق انسانی کی تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ یہ مثال سامنے آئی کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شامی بادشاہ جبلہ بن ایہم مسلمان ہو کر حج کے لیے آیا اور حج کے مجمع میں ایک غریب مسلمان کا پیر اس کی گھسٹتی ہوئی چادر پر پڑ گیا جس سے اس کو دھکا لگا، اس نے اپنی ذلت محسوس کر کے اس کے طمانچہ مار دیا، اس غریب شخص نے حاکم کے یہاں شکایت کی، حاکم جو حضرت عمرؓ تھے انہوں نے اس کو انتقام لینے کا حق دیا، اس پر بادشاہ نے کہا کہ یہ چھوٹا آدمی کیا انتقام میں میرے طمانچہ مارے گا؟ لیکن جب اس نے دیکھا کہ حکم یہی ہے تو اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہوئے حج چھوڑ کر رات ہی رات چلا گیا اور اسلام ترک کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے باوجود اپنا فیصلہ نہیں بدلا اور کہا دونوں برابر ہیں، اس لیے برابری ہی کا معاملہ کرنا ہوگا، اور اس کی پرواہ نہیں کی وہ مسلمانوں سے برگشتہ ہو کر اپنے سابقہ مذہب میں چلا گیا۔

ایک دوسرے واقعہ میں مصر کے حاکم حضرت عمرو بن العاصؓ کے صاحبزادے نے ایک مصری کو گھوڑ دوڑ کے موقع پر طمانچہ مار دیا اور کہا کہ لو یہ ایک سردار کا ہاتھ ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس حاکم کے لڑکے کو مع حاکم کے اپنے دارالخلافہ میں طلب کیا، وہ سفر کر کے مدینہ آئے، مصری شہری کو بھی طلب کیا اور کہا کہ تم انتقام لو اور ان کے طمانچہ مارو، پھر فرمایا اللہ نے سب کو آزاد انسان کی حیثیت سے پیدا کیا ہے، کیا تم ان کو غلام بنا لو گے؟

یہ اور اس طرح کی دسیوں مثالیں تاریخ اسلام میں ملتی ہیں، مسلمان جس وقت نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کے پہلو میں مختلف نسل کے، مختلف کلچر، مختلف حیثیتوں کے لوگ ہوتے ہیں، اور کسی کو یہ حق نہیں دیا جاتا کہ وہ یہ کہے کہ فلاں آدمی ہمارے برابر کا نہیں ہے، ہمارے ساتھ نہیں کھڑا ہو سکتا ہے۔

مساوات انسانی کی ایک اعلیٰ مثال

اس سلسلہ میں موجودہ عہد کا بھی ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ سعودی عرب کے شاہ فیصل جوز بردست حاکم اور بادشاہ تھے، کعبہ میں زیارت وطواف کے لیے آئے، ان کے ساتھ سکیورٹی تھی، ان کے لیے طواف کے بعد نماز پڑھنے کے لیے ایک خالی جگہ پر مصلی بچھایا گیا کہ وہ اس پر نماز ادا کریں گے، لیکن ان کے آنے کے وقت بالکل قریب ایک عام حبشی طرز کا مسلمان جوان سے پہلے طواف کر کے آ گیا تھا وہ بلا غور کیے عام مصلی سمجھ کر اس پر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا، بادشاہ اسی وقت پہونچے، یہ دیکھ کر کہ کوئی دوسرا اس جگہ پر کھڑا ہو گیا ہے اس سے ہٹ کر بلا مصلّٰی نماز پڑھی اور نہ خود اعتراض کیا اور نہ سکیورٹی کے لوگوں کو اعتراض کرنے دیا۔

یہ اسی اعلان مساوات اور حقوق انسانی کے اعلان کا نتیجہ ہے جس کی تلقین اس امت وسط کے نبی محمد (ﷺ) نے کی اور تعمیل کرائی، لہٰذا مسلمانوں کی جن سوسائٹیوں میں اسلامی قدریں قائم ہیں وہاں ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح کی مساوات برتی جاتی ہے، خواہ کھانے کا دستر خوان ہو یا مسجد کی جماعت کی نماز ہو، خواہ امامت، خطابت اور تعلیم ہو یا تربیت وقیادت کے مواقع ہوں، تاریخ میں بکثرت اس کی مثالیں ہیں کہ بڑی بڑی علمی شخصیتیں، مسجدوں کے امام، مدرسوں کے اساتذہ، اور معلم ومفکر ہر طبقہ کے ہوئے ہیں اور لوگوں نے ان کو سر پر بٹھایا ہے، اور ان کے ناموں سے ان کے طبقہ کی نسبت ظاہر ہوئی، کسی کے نام کے ساتھ 'تیلی' کی نسبت ہے، کسی کے نام کے ساتھ 'عطار' ہے، کسی کے نام کے ساتھ 'درزی' ہے، حتی کہ 'باورچی' 'موچی' تک کی نسبت ملتی ہے، اور ابھی چند سال قبل حرم کعبہ کے امام وخطیب کے ساتھ 'درزی' کا لفظ تھا۔

عورت کے ساتھ عزت ومساوات کا معاملہ

اسی طرح عورتوں کے ساتھ سلوک ومعاملہ میں برابری کے سلوک کی تلقین بار بار فرمائی گئی اور اس پر برابر عمل کیا گیا، لیکن جسمانی طور پر اور صلاحیت عمل کے اعتبار سے اور تأثر واحساس کی شدت وکمی کے لحاظ سے مرد وعورت میں جو فطری فرق ہے اس فرق کی

رعایت کی گئی، دونوں کا آپس میں ازدواجی تعلق قائم کرنا اور ایک دوسرے سے ہم آہنگی قائم نہ رکھنے کی صورت میں علاحدگی اختیار کرنا ان دونوں باتوں کا حق دونوں کو تقریباً برابر سطح کا دیا گیا، جس کی شکل مرد کے لیے طلاق دینے اور عورت کے لیے خلع حاصل کر لینے میں مقرر کی، مرد کو بڑا قرار دیا کیونکہ شادی کرنے اور گھر چلانے کے اخراجات کا سارا بوجھ مرد پر ڈالا، کیونکہ آمدنی کے حصول کی ذمہ داری اصلاً اس پر ہی ہوتی ہے، اور گھر کے اندر کا نظم و انتظام عوت کو کرنا ہوتا ہے لیکن ضرورت پڑنے پر عورت کو زندگی کے دوسرے کام کرنے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن اسی کے ساتھ حیا اور عفت کا پورا لحاظ رکھنا لازمی قرار دیا گیا ہے تا کہ بداخلاقی اور فسق و فجور کی صورتوں پر روک لگ سکے، عفت و حیا کی حفاظت کی خاطر اسلام نے جو پابندیاں عورت کے لیے لگائی ہیں، ان کا مقصد عورت کو آزادی کے ساتھ انسانی حق سے محروم کرنا نہیں بلکہ اس کو اور اس کے قریب کے مردوں کو فسق و فجور کے محرکات سے بچانا ہے، اسی لیے مرد و عورت کے درمیان تعلق و وابستگی کے لیے نکاح کا طریقہ لازم کیا گیا ہے اور غیروں کے سامنے اپنے کو زنانہ کشش کے ساتھ لانے کو منع کیا ہے اور اس کا تحفظ اپنے جسم کے پوشیدہ رکھنے سے کیا ہے یہ سب وہ حکمت کی باتیں ہیں جو آزادی نسواں کے مفاسد سامنے آنے پر سب کو صحیح اور مناسب معلوم ہوئیں۔

سیاست و حکومت میں مساوات و انصاف

آزادی اور مساوات اور حقوق انسانی کی جو رعایت اسلام نے اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں کی ہے اس میں حکومت و سیاست، تجارت و عام معاملات بھی اس کے دائرے میں شامل ہیں، حاکم وقت کا تقرر و انتخاب مسلمانوں کے معیاری صفات رکھنے والے اعلیٰ کردار کے افراد کی تجویز و تائید سے کرنے کا اصول مقرر کیا گیا ہے جس کے بعد پوری قوم کی تائید حاصل کرنا ہوتی ہے، پھر منتخب ہو جانے کے بعد وہ بالکل خود مختار حاکم نہیں ہوتا بلکہ خدا کے حکم اور رسول اللہ (ﷺ) کی ہدایات کے مطابق انتظام کرنے والا بننا پڑتا ہے جو اپنی محض پسند اور جی سے کوئی کام نہیں کرتا بلکہ احکام الٰہی کی تابعداری میں اور معیاری

مسلمانوں کے مشورہ کے ساتھ کام کرتا ہے، لیکن کام کو انتشار سے بچانے کے لیے آخری فیصلہ اوراس فیصلہ کے مطابق نفاذ کا اسی کو اختیار دیا گیا ہے، اوراس کی حیثیت امیر کی رکھی گئی ہے کہ امیر بنا دینے کے بعد امیر کی بات سب کو ماننی ہوئی ہے، ایسے حاکم کو 'امیر المومنین' یا 'خلیفہ' جیسے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، اس طرز کے حاکموں کی تعداد اسلامی تاریخ میں اچھی خاصی ہے کہ جو اپنی ذات کی فکر کو پیچھے رکھتے اور جماعت اور قوم کی مصلحت کو آگے رکھتے تھے، اپنا حق کم سے کم لیتے اور دوسرے کو حق دینے میں اپنی جان کھپا دیتے تھے، حضور اکرم (ﷺ) اور آپ (ﷺ) کے بعد چاروں خلفائے راشدین پھر بعد میں آنے والے چند در چند مسلمان حاکموں نے اس طرح کی حکمرانی کی مثالیں پیش کی ہیں جس سے یہ نمونہ کھل کر سامنے آتا رہا کہ حاکم کا کام عیش کرنا یا فائدہ اٹھانا نہیں بلکہ قوم کے فرد فرد کی خدمت کرنا، اوراس کی مصلحت کی حفاظت کرنا ہے، اسلامی سیاست میں عہدہ کے لیے آدمی خود کو پیش نہیں کرتا بلکہ اس کو عہدہ لینے پر راضی کیا جاتا ہے، وہ اپنے لیے زائد عزت اور عظمت کا حق نہیں لیتا بلکہ اپنے کو اپنی حکومت کے عام فرد کی سطح کے مطابق رکھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں اپنی ذات کا یا اپنے قبیلہ اور خاندان کا فائدہ سامنے نہیں رکھتا، بلکہ خدا کے حکم کی تعمیل اور اپنی قوم کی مصلحت کو آگے رکھتا ہے، اس طریقہ سے سیاست میں اسلامی قدروں کو اپنانے کی وجہ سے حکومت کا منصب حاصل کرنے کے لیے رسہ کشی کا راستہ بند ہو جاتا ہے، اسلامی تاریخی کے واقعات وحالات کو بالتفصیل دیکھنے سے ایسی سیاست وحکومت کی بہت سی مثالیں مختلف دور میں ملتی ہیں، اس طرح اس معیاری امت کے نمائندوں نے دنیا کے سامنے سیاست وحکومت میں بے غرضی تواضع اور خدمت کی اعلیٰ مثال کھول کر رکھ دی ہے کہ اس معاملہ میں بھی سب برابر ہیں، ترجیح صرف نیک اور صاحب صلاحیت اور قوم ووطن کے مخلص اور خیر خواہانہ جذبہ رکھنے والے کو دی جائے، اوراس سلسلہ میں حاصل ہونے والے منصب سے اپنا ذاتی نفع حاصل کرنا مقصد نہ ہو، اور محض اپنی خواہش کو کسی مسئلہ کے سلسلہ میں فیصلہ کن نہ بنایا جائے، بلکہ اپنی مفوضہ ذمہ داری میں رضائے الٰہی کی طلب اور خلق خدا کی راحت ہی کو پیش نظر رکھا جائے، اور یہ اسلام کی محض اصول وتعلیم ہی نہیں رہی ہے، بلکہ اسلامی تاریخ

میں اس کی اعلیٰ عملی مثالیں بھی برابر ملتی رہی ہیں کہ مسلمان حاکم وقت، حکومت کا منصب ملنے پر اپنے ان مادی فوائد سے بھی محروم ہو گیا جو اس کو منصب سے پہلے اپنے کام سے حاصل ہو رہے تھے، اور اس کو صرف بقدر کفایت معاشی سہولت پر اکتفاء کرنی پڑی۔

ایسی مثالوں کے ساتھ اگرچہ بہت سی خودغرضانہ مثالیں بھی ہیں لیکن شریعت اسلامی کی پابندی کرنے والوں کی بھی ہر دور میں اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں جو اچھے انسانوں کے لیے بطور نمونہ کافی ہیں جن کے حوالہ سے امت وسط کی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کو راہ دکھائے اور پھر اس بات کو دیکھے کہ کس نے راہ حق کو قبول کیا اور کس نے قبول نہیں کیا۔

حاکم کے انتخاب کا طریقۂ کار

حکومت و سیاست میں اسلام کا یہ اصول جس کا انطباق اعلیٰ مثالوں میں ملتا ہے، دنیا کے سامنے واضح ہوتا رہا کہ حکومت کے عہدہ کا خود طلب گار بننا صحیح نہیں ہے، اور یہ کہ وہ اس معاملہ کے واقف اور معتبر اشخاص کی تجویز پر دیا جائے گا، خواہ وہ حاکم اعلیٰ کی طرف سے نامزدگی کی صورت میں ہو اور خواہ معتبر اور مخلص لوگوں کی طرف سے انتخاب کی صورت میں ہو، خلافت راشدہ کے دور میں خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر یہ دونوں صورتیں عمل میں آئیں، حضرت ابوبکرؓ کو عہدہ خلافت اس وقت کے اہم واصحاب الرائے مسلمانوں کے انتخاب سے ملا تھا، اور حضرت عمرؓ کو اپنے پیش رو خلیفہ کی نامزدگی پر ملا تھا، اور دونوں کو عہدہ ملنے کے بعد اپنی دنیاوی منفعتوں کو چھوڑنا پڑا تھا، دونوں کو بلا طلب عہدہ ملا اور دونوں اس ذمہ داری کو اٹھانے کا اپنے کو لائق نہیں بتاتے تھے، اور قوم و ملت کی خاطر بتکلف راضی ہوئے تھے، معیار اعلیٰ کے اعتبار سے اور مادی منفعت سے ہٹ کر عہدہ قبول کرنے میں تیسرے اور چوتھے خلیفہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا بھی یہی رویہ تھا، خلفائے بنو امیہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی اس سلسلہ کی شاندار مثال قائم کی اور بعد میں بھی اس سلسلہ کی چھوٹی بڑی مثالیں اسلامی تاریخ میں برابر ملتی رہیں، اور یہ سلسلہ برابر قائم رہا، اور اس طرح اس معیاری امت نے دوسروں کو اس سلسلہ کی اعلیٰ مثالوں کے نمونے دکھائے اور اپنی ذمہ داری پوری کی۔

علم کی خدمت اور اس میں تفوق و امتیاز

علم وفکر کے میدان میں بھی اس امت نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے اور اعلیٰ انسانی مثالیں قائم کیں، علم کا وہ حصہ جو وحی الٰہی اور سنت نبوی (ﷺ) سے تعلق رکھتا ہے اور جس کو آسمانی ہونے کا تقدس حاصل ہے، اس میں بھی کمال و وسعت کے بیش بہا نمونے اور کارنامے اس امت نے پیش کیے، آسمانی کتاب قرآن مجید کی تشریح اس کے الفاظ و معانی کی گہرائیوں کو سمجھنا اور سمجھانا اور اس کے نکتوں کی تحقیق کر کے واضح کرنا، اور کلام نبوی (ﷺ) کی ایسی خدمت کرنا کہ اس میں کسی دوسرے کی طرف سے تغیر یا حذف و اضافہ کا کوئی اثر نہ پڑ سکے، اور دینی احکام اور مذہبی حقائق صاف اور واضح طریقے سے متعین ہو جائیں اور اس دین کے دین کامل ہونے اور اس کی شریعت کے مکمل اور تا قیامت کارفرما رہنے کی ضمانت ہو جائے، ایسی مثالیں جو پوری انسانیت کی تاریخ میں اور جگہ نہیں ملتیں، اس مقصد کے لیے ان کو متعدد نئے علوم مدون کرنے پڑے اور اس میں بھی انہوں نے علمی کمال کا ثبوت دیا، خاص طور پر ''اسماء الرجال'' اور حدیث کے راویوں کے طبقات اور ان کا تحقیقی کام اور قرآن و حدیث سے باقاعدہ اعلیٰ درجہ کا ضابطۂ حیات کی تدوین و ترتیب بے مثال عملی سرمایہ ہے اور دین کے مکمل کیے جانے کے بعد اس کے مکمل ثابت ہونے اور مکمل طور پر جاری رہنے کی دلیل ہے، اس طریقہ سے مذہب اور قوانین مذہب کے علوم کا ایک نیا خزانہ تیار ہو گیا کہ جس کے چوٹی کے ماہرین کی بڑی تعداد ملتی ہے پھر یہ کہ اس طرح کی خدمت علمی کا سلسلہ مسلسل قائم ہے، اس میں انسانی زندگی کے طور و طریق جو خواہ مذہبی پہلو کے ہوں اور خواہ معاملاتی پہلوؤں کے قوانین شریعت کا ایسا مفصل اور جامع دستور مرتب کر دیا گیا جو دنیا کی دیگر قوموں میں نہیں ملتا۔

عقلی اور تجرباتی علوم میں بھی اس ملت کے علماء نے بڑی موشگافیوں اور تحقیقات و تجربات کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں، ان علوم میں فلسفہ و منطق، علم کلا، ہیئت و ریاضی، سائنس اور دیگر علوم کو ان کے ساتھ عقائد و نظریات اور دیگر علمی مضامین شامل رہے ہیں، مسلمان اہل علم و تحقیق نے فلسفہ و نظریاتی علوم میں، اسی کے ساتھ سائنس اور تجرباتی علوم میں جو کتابیں اور

تحقیقاتی مباحث پیش کئے ان سے آج تک کسب فیض کیا جارہا ہے، انہوں نے اس سلسلہ میں کتابوں کا ایسا سرمایہ تیار کیا جو نہایت بیش بہا سرمایہ قرار پایا جن میں سے علوم دینیہ میں اتنی وسعت اور اتنا عمق پیدا کیا کہ دیکھ کر انسانی عقل ششدر رہ جاتی ہے، اس کے علاوہ تجرباتی علوم میں اس کے جلیل القدر محققین نے علماء نے بڑا امتیاز پیدا کیا اور نئی راہیں بنائیں اور خاص طور پر طب کے سلسلہ میں خصائص اشیاء اور معالجات کا جو سرمایہ ان کو قدیم حکمائے سے ملا، اس میں انہوں نے ایسے عظیم اضافے کئے اور ایسے تحقیقی اور تجرباتی نظریات قائم کئے کہ آنے والی نسلوں کے لیے وہ اصل طبی نظریات بن گئے اور عصر جدید کے تمدن کے اطباء کو بھی ان سے استفادہ سے استغناء نہیں رہا، جن میں خاص طور سے ابن سینا کی طب کی کتاب، طب کی کتابوں میں امام وپیشوا کا درجہ رکھتی ہے۔

الٰہیات وعقائد پر جو فلسفہ اور مذہب دونوں سے تعلق رکھنے والا علم ہے ایسا کام کیا گیا جس کا تاریخ میں نمایاں مقام ہے، خاص طور پر عقائد کی تصحیح اور الٰہیات میں سابق ملحد ومشرک حکماء کی تحقیقات کا جائزہ اور ان کے منحرف پہلوؤں کی نشاندہی کا کام منفرد کام ہے، جو ملت کے متعدد عظیم المرتبت علماء نے انجام دیا، اس میں امام غزالیؒ کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔

پھر ان سب علوم کو نئی نسلوں کو منتقل کرنے کے لیے تعلیم گاہوں اور مدرسوں کا سلسلہ قائم ہوا اور کتابوں میں مدوّن کرنے کا زبردست کام ہوا جن سے شائقین علم کی نئی نسلیں برابر کام لیتی چلی آرہی ہیں۔

علوم دینیہ کے ساتھ تجرباتی اور طبیعاتی علوم کے ساتھ بھی ہر زمانہ میں اہل علم کے طبقہ نے اشتغال رکھا، اور علم ہیئت، علم جغرافیہ، اور خواص اشیاء اور علم الاجسام ودیگر طبیعاتی علوم میں بڑی تحقیقات وتجربات سے کام لیا، جن سے موجودہ دور کے ترقی یافتہ علوم کے ماہرین نے خصوصی فائدہ اٹھایا۔

عصر جدید کے ان علوم کے ماہرین نے عام طور پر اس کا اعتراف کیا ہے اور مختلف علوم میں مسلمان سائنس دانوں کے تجربات اور غیر معمولی انکشافات کا حوالہ دیا ہے، اور کئی

سائنس دانوں اور فلسفیوں کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے اوران کے کیے ہوئے کام کوان علوم کے مراجع میں شامل کیا ہے، ان عظیم ماہرین علوم میں خاص طور پر ''ابن الہیثم'' اور ''البیرونی''، ابن سینا، ابن رشد، عمر خیام، جابر بن حیان اور الغزالی بہت نمایاں نام ہیں۔

علوم میں خاص طور سے جغرافیہ میں مسلمان جغرافیہ دانوں نے جو کام انجام دیا ہے، اس کو جغرافیہ کی معلومات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، سمندری سیاحت اور جہاز رانی میں بھی غیر معمولی کارنامے ملتے ہیں، اور یہ اس زمانہ کی بات ہے کہ معلومات کے حصول کے ذرائع بہت محدود تھے، لیکن ان شائقین علم نے اپنے کو خطرہ میں ڈال ڈال کر یہ کام انجام دیے، آج کے ترقی یافتہ دور میں ذرائع کی آسانی کی وجہ سے ویسی محنت وقربانی کی ضرورت نہیں پڑتی جیسی قدیم زمانہ میں پڑتی تھی اس کے باوجود ان قدیم اہل علم نے ہمت نہیں ہاری اور محیر العقول کام انجام دیئے۔

انہوں نے علوم کی ترویج میں ان کے حصول کے لیے تسہیل کی فکر غیر معمولی طریقہ سے انجام دی کثرت سے تعلیم گاہوں کا قیام، اور تحقیقات کے لیے تجرباتی مراکز اور سہولتوں کا انتظام بڑے اہتمام سے کیا جاتا تھا، اور شوق علم میں اہل طلب پیدل اور سواری پر علم کے حصول کے لیے جہاں اس کے ماہرین کا پتہ چلتا وہاں پہونچتے اور اس کے لیے ہر طرح کا تعب اور مشقت برداشت کرتے، چنانچہ اس کے نتائج حیرتناک نکلتے تھے، جن سے آج تک مدد اور روشنی حاصل کی جارہی ہے۔

مسلمانوں کی علم دوستی اور تحقیقات وتجربات کی کوششوں کا یہ زمانہ تقریباً چھ صدیوں تک پھیلا ہوا ہے، اور یہی زمانہ مغربی ممالک کا جو آج انتہائی علمی وتمدنی ترقی کرنے والے ممالک قرار دیئے گئے ہیں، نہایت تاریکی اور جہالت کا زمانہ رہا ہے، اس وقت مغربی ممالک اور مسلم ممالک میں علم وتمدن کے لحاظ سے بہت زیادہ فرق تھا بلکہ تضاد تھا، ایک طرف جہالت اور پسماندگی تھی، دوسری طرف علم کا فروغ وکمال تھا۔

علوم وفنون میں مسلمانوں کا تفوق اور مغربی افکار پر اثرات

جن اہم اور بنیادی میدانوں میں اسلامی تہذیب وتمدن کے انمٹ اثرات پڑے

ان میں پہلا میدان عقیدہ اور دین کا میدان ہے۔•

یہ حقیقت ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے لے کر موجودہ دور میں بیداری کی لہر دوڑنے تک یورپ میں مذہبی اصلاح کے نام پر جو تحریکات اٹھیں ان میں اسلامی تہذیب کا بڑا گہرا اثر ہے کیونکہ اسلام ہی نے پوری قوت کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ اللہ ایک ہے، تنہا وہی قادر مطلق ہے، اسی کا اختیار اور اقتدار ہے، وہ جسم سے اور ہر قسم کے نقص اور کمی اور ظلم وزیادتی سے پوری طرح پاک اور منزّہ ہے، اسی طرح اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ انسان کو خدا کی عبادت کرنے، اس کے ساتھ تعلق وابستہ کرنے میں علماء ومشائخ، پوپ وپادریوں اور پروہتوں کو ذریعہ بنانے کی ضرورت ہیں، وہ براہ راست اپنے پروردگار کو پکاریں اور براہ راست اسی سے مانگیں، اس کو ہر شخص کے لیے حاضر وناظر سمجھیں، وہ سب کی براہ راست سنتا اور دیتا ہے، یہ وہ چیز ہے جو دوسری قوموں کے ذہن کے دریچوں کو کھول کر اوران کا شعور بیدار کر کے ان طاقتور اور پرکشش اصولوں کو اپنانے کا بہت بڑا سبب بنی، کیونکہ اس وقت دوسری قومیں سخت مذہبی جھگڑے کی ہتھکڑیوں میں جکڑی ہوئی تھیں، ان کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں تھی، ان کے افکار وخیالات، اموال وابدان غرض ساری چیزوں پر مذہبی پیشواؤں کا اقتدار تھا، وہ ان کے ساتھ جو چاہتے سلوک کر سکتے تھے، توان حالات میں جبکہ مشرق و مغرب میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ چل پڑا تھا اور بہت سے ممالک اس کے زیر نگیں آچکے تھے، یہ طبعی بات تھی کہ پڑوس کی اقوام سب سے پہلے عقیدے سے متعلق اسلامی بنیادوں اور اصولوں سے متأثر ہوں اور ایسا ہی ہوا چنانچہ ساتویں صدی عیسوی میں مغربی ممالک میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو تصویر کی عبادت پر نکیر کرنے لگے اور ان کے بعد ایسے لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے جو اللہ اور بندوں کے درمیان واسطہ کا انکار کرنے لگے اور جو کتب مقدسہ کو سمجھنے میں دینی رہنماؤں کے اثر اور نگرانی سے آزاد ہو کر خود سے سمجھنے کی دعوت دینے لگے۔ متعدد محققین ذکر کرتے ہیں کہ مارٹن لوتھر (Martin Luther) اپنی مذہبی اصلاحی تحریک چلانے میں فلاسفۂ عرب اور مسلم علماء سے متأثر تھا کیونکہ اس نے دین، عقیدہ اور وحی کے سلسلہ میں ان کے خیالات پڑھ لیے تھے، اس کے زمانہ میں یورپ کی درسگاہیں مسلم فلاسفہ ہی کی ان

کتابوں پر تکیہ کرتی تھیں جو بہت پہلے لاطینی زبان میں منتقل ہوگئی تھیں، دین وسلطنت کے درمیان جدائی کی تحریک جس کا انقلاب فرانس میں ڈھنڈورا پیٹا گیا وہ ان سخت پر تشدد فکری تحریکوں ہی کا نتیجہ تھی جو تین بلکہ اس سے زیادہ صدیوں تک یورپ پر چھائی رہیں، ہماری تہذیب کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے صلیبی جنگوں کے راستہ سے اور اندلس کے راستہ سے یورپ کے دماغ کی چنگاری کو بھڑکایا اور اس کا شعور بیدار کیا۔

دوسرا میدان جس میں اسلامی تہذیب کا اثر واضح طور پر ظاہر ہوا وہ علم اور فلسفہ کا میدان ہے۔طب، ریاضات، علم کیمیاء جغرافیہ اور فلکیات پر اس نے جو اثر ڈالا وہ ناقابلِ فراموش ہے، ہمارے علماء اور فلاسفہ ہی کی آواز پر یورپ خواب غفلت سے بیدار ہوا، وہ اشبیلیہ، قرطبہ اور غرناطہ وغیرہ کی مسجدوں میں ان کا درس دیتے تھے۔یورپ کے ابتدائی طلباء جو ہمارے مدارس کا رخ کرتے تھے، بڑے شغف اور دلچسپی کے ساتھ ایسی آزاد فضا میں یہ علوم حاصل کرتے تھے جس کی اپنے ملک میں وہ کوئی نظیر نہیں دیکھتے تھے۔

اس وقت جب ہمارے علماء اپنے علمی حلقوں اور اپنی کتابوں میں زمین کی کروی شکل اور اس کی گردش اور دوسرے اجرام سماویہ کی حرکت کے متعلق بیان کرتے تھے اہل یورپ کے دماغ ان حقائق کے بارے میں اوہام وخرافات سے بھرے ہوئے تھے، یہیں سے اہل مغرب میں ان کتابوں کے عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کرنے کا رجحان پیدا ہوا اور ہمارے علماء کی کتابیں مغرب کی درسگاہوں میں پڑھائی جانے لگیں، بارہویں صدی میں ابن سینا کی طب کی مشہور کتاب ''القانون'' کا ترجمہ کیا گیا، اسی طرح تیرہویں صدی کے اواخر میں رازی کی ''الحادی'' بھی ترجمہ ہوکر لاطینی زبان میں منتقل ہوئی، یہ کتاب القانون کے مقابلہ میں بہت وسیع اور ضخیم ہے۔یہ دونوں کتابیں سولہویں صدی تک یورپ کی درسگاہوں میں طب کی تدریس کی بنیاد بنی رہیں، جہاں تک فلسفہ کی کتابوں کا تعلق ہے تو وہ اس سے زیادہ وہاں رائج ہوئیں بلکہ اہل مغرب فلسفۂ یونان سے واقف ہماری ہی کتابوں اور ان کے ترجموں کے ذریعہ سے ہوئے۔یہیں سے بہت سے انصاف پسند مغربی دانشور اعتراف کرتے ہیں کہ ہم قرون وسطی میں کم از کم چھ سو سال تک یورپ کے استاذ بنے رہے۔

''مشہور مغربی فاضل غوستاف لوبون (Gustav Lobon) نے لکھا ہے کہ عربوں کی کتابوں کے ترجمے بالخصوص علمی کتابیں پانچ چھ صدیوں تک یورپ کی دانش گاہوں میں تدریس کا تقریباً یہی تنہا مصدر بنی رہیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم طب وغیرہ میں عربوں کا اثر آج تک ہمارے اس زمانہ میں بھی باقی ہے چنانچہ گزشتہ صدی کے اواخر میں مونپلیہ (Montpellier) میں ابن سینا کی کتابوں کی شروحات لکھی گئیں۔ یہی عالم آگے لکھتا ہے کہ راجر بیکن (Roger Beacon)، لیونارڈ البیری (Leonard Albeary)، ارنو الفیلو فی، رایموندوس لولوس (Raymundus Lullus)، سان ثوما، البرٹ کبیر، اذفونش عاشر قشتانی نے صرف عربوں کی کتابوں کا سہارا لیا۔

میسور نیان کا کہنا ہے کہ البرٹ کبیر' ابن سینا کا مرہون منت ہے اور سان ثوما اپنے فلسفہ میں ابن رشد کا ممنون ہے۔ جرمن مستشرق پروفیسر سید یو (L.A.Seillot) لکھتا ہے: قرون وسطی میں تنہا عرب تہذیب وتمدن کے علمبردار تھے، انہوں نے یورپ کی بربریت کو مٹایا جس کو شمالی قبائل کے حملوں نے متزلزل اور کمزور کردیا تھا، اور عربوں نے فلسفۂ یونان کے زندہ جاوید چشموں کی طرف رخ کیا تو انہوں نے وہاں سے جو علمی خزانے حاصل کیے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کو اور وسعت دی اور نیچر کے مطالعہ کے نئے دروازے کھولے۔ مزید لکھتا ہے کہ عربوں نے جب علم ہیئت کو اپنایا تو ریاضی کی ساری شاخوں پر خاص توجہ دی، اس میں انہیں کو سبقت حاصل ہے۔ فی الوقت اس میدان میں وہ ہمارے استاد تھے۔ اور آگے لکھتا ہے: عربوں سے اہل یورپ نے ابتداءً جو علوم حاصل کیے، اس سلسلہ میں جب ہم غور وخوض کرتے ہیں اور تحقیق سے کام لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جیر برٹ (Jerbert) نے (جو سلفسر دوم (Sylvester II) کے نام سے بابا

کے مقام پر فائز ہوا) اندلس میں جو علم ریاضی کی تعلیم حاصل کی تھی، ۹۷۰ء اور ۹۸۰ء کے مابین اس کو یورپ لے آیا۔ اور ادھیلارڈ (Athelard) نے ۱۱۰۰ء اور ۱۱۲۸ء کی درمیانی مدت میں اندلس اور مصر کے چکر کاٹے اور اقلیدس (Euclid) کی کتاب "الأرکـــــــان" (Elements) کا عربی سے ترجمہ کیا جس سے اہل مغرب بالکل نا آشنا تھے۔ افلاطون (Aflatoon) نے تادوسیوس (Theodosius) کی کتاب "الأکـــــــر" کو عربی سے لاطینی میں منتقل کیا۔ رودلف برونی (Rudolf Bruni) نے بطلیموس (Ptolmey) کی زمین کے آباد حصہ سے متعلق جغرافیہ کی کتاب کا عربی سے ترجمہ کیا۔ لیونارد البیزی نے ۱۲۰۰ء کے آس پاس 'جبر' میں ایک رسالہ لکھا، یہ علم اس نے عربوں سے حاصل کیا تھا، کیتا نوس بنری نے عربوں ہی سے تیرہویں صدی عیسوی میں اقلیدس کی کتاب کا بہت عمدہ ترجمہ کیا اور اس کی شرح بھی کی۔ اسی صدی میں فیتلیون بولونی نے حسن بن الہیثم کی کتاب " البصریات" کا ترجمہ کیا اور جیرارڈ کرمونی (Gerard of Cremona) نے اسی صدی ہی میں بطلیموس کی" الـمـجـسـطـی" (Almagest) اور جابر کی شرح کا ترجمہ کر کے ٹھوس اور حقیقی علم فلکیات کو بہت عام کیا۔ ۱۲۵۰ء میں اذفونش قشتالی نے علم فلکیات کے زائچوں کو رواج دینے کا حکم دیا جو اسی کے نام سے معروف ہیں۔ جب ایک طرف روجر اول (Roger I) نے صقلیہ میں عربوں کے علوم کی تحصیل پر ابھارا بالخصوص ادریسی کی کتابوں کی، تو دوسری طرف رومن امپائر فریڈرک (Fredrieck) دوم بھی عربوں کے علوم وفنون کے مطالعہ پر آمادہ کرنے میں اس سے کچھ پیچھے نہیں تھا۔ ابن رشد کے لڑکے اس شہنشاہ کے دربار شاہی میں رہ کر اس کو نباتات اور حیوانات کی تاریخ سکھاتے۔ ہومبلڈ (Alexnder Von Humbold) کائنات

سے متعلق اپنی کتاب میں ذکر کرتا ہے کہ کیمیاوی ادویہ کے موجد عرب ہی ہیں اور عرب ہی سے وہ ابتدائی ٹھوس تعلیمات آئیں جس کی نسبت سالیرم کی درسگاہ کی طرف کی جاتی ہے، جنوبی یورپ میں ایک زمانہ بعد یہ تعلیمات عام ہوئیں، جڑی بوٹیوں کا علم اور طب' جن دو چیزوں پر فن علاج وشفاء کی بنیاد ہے، ایک ہی وقت میں علم نباتات اور علم کیمیا کے مطالعہ کا سبب بنا، دو مختلف راستوں سے اور عربوں کے ذریعہ اس علم کے ایک جدید دور کا آغاز ہوا۔ علم نباتات سے عربوں کی گہری واقفیت ہی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ذلیفوریدس کے پودوں میں دو ہزار پودوں کا اضافہ کیا۔ اسی طرح عربوں کی جڑی بوٹیاں اور ترکیب ادویہ کا علم بہت سے ایسے پودوں پر مشتمل ہے جس سے اہل یونان بالکل ہی ناواقف تھے۔ رازی اور ابن سینا کی متعلق سیدیو لکھتا ہے کہ وہ دونوں اپنی کتابوں کے ذریعہ ایک زمانہ دراز تک مغربی درس گاہوں پر چھائے رہے، اور ابن سینا تو یورپ میں طبیب ہی کے نام سے معروف ہوا، وہاں کی درسگاہوں پر تقریباً چھ صدیوں تک بلاشرکت غیرے اسی کا اثر واقتدار قائم رہا، اس کی پانچ حصوں پر مشتمل ضخیم کتاب ''القانون'' ترجمہ ہو کر کئی دفعہ شائع کی گئی کیونکہ فرانس اور اٹلی کی دانش گاہوں میں اسی کو بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ (۱)

کتب خانوں کا اہتمام

مسلمانوں نے اپنی چھ سو سالہ غیر معمولی علمی فروغ کی مدت میں بے شمار کتابیں تصنیف کیں جن کے ذریعہ علمی تحقیق اور انکشافات ومعلومات کا ذخیرہ تیار کر دیا، یہ زمانہ طباعت کا زمانہ نہ تھا اور کاغذ کی صنعت اپنے عروج تک نہیں پہونچی تھی، شروع شروع میں ہرن کے کاندھے پر واقع جھلی سے کام لیا، اور اس پر تحریر کردہ کتابوں کا ذخیرہ تیار کر دیا، اس کے علاوہ کاغذ پر کتابیں تحریر کی گئیں جو باوجود صدیاں گزر جانے کے ابھی تک مسلمان ممالک

(۱) من روائع حضارتنا از ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی صفحہ ۸۳-۸۶ (ط-دارالوراق، بیروت)

کے قدیم اور بڑے کتب خانوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، اس زمانہ کی کتابیں سب قلمی ہوتی تھیں اور شائقین علم ان کی نقلیں کراتے اور اپنے ذاتی کتب خانوں کی زینت بناتے تھے، اس سے پورے عالم اسلام میں علم کا چرچا اور فروغ بڑھتا گیا، پھر بتدریج یورپ کے لوگوں کو توجہ ہوئی اور انہوں نے اپنی علمی ترقی کا آغاز انہی کتابوں سے کیا اور بعد میں جب وہ ملک طاقتور اور سامراجی بنے تو مسلمان ملکوں کو مغلوب کر کے ان کی کتابوں کے بہت سے ذخائر اپنے کتب خانوں کے لیے لے لیے جو آج بھی ان کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے علمی عروج کے دور میں ان کے ملکوں میں جگہ جگہ کتب خانے قائم ہوئے جن میں کتابوں کی بڑی تعداد ہوتی تھی، یہ کتب خانے حکومتی سطح کے بھی ہوتے تھے اور ذاتی سطح کے بھی، ان میں کتابوں کی تعداد کا اندازہ ذیل کی تفصیل سے کیا جاسکتا ہے:

دورِ عروج کے کتب خانے

چھ صدی سے زیادہ کے اس عرصہ میں مختلف علوم وفنون پر مسلمانوں نے بے شمار کتابیں تصنیف کیں، انسانی علوم ومعارف کا کوئی راستہ ایسا نہیں بچا جس پر مسلمانوں نے اپنے نقش قدم نہ چھوڑے ہوں، حجاز مقدس، عراق، شام، مصر، مغرب عربی اور اندلس وغیرہ میں لاتعداد کتب خانے قائم ہوگئے، یہ کتب خانے عموماً تین طرح کے تھے:

مساجد میں قائم کتب خانے

کم وبیش ہر مسجد میں یہ کتب خانے قائم تھے، جہاں طلباء اور علماء کے لیے تمام ضروری سہولتیں مہیا ہوتی تھیں، ان میں سے بہت سے کتب خانوں میں قلمی نسخوں کے بڑے بڑے ذخائر تھے۔

ذاتی کتب خانے

وزیروں، امیروں اور رئیسوں نے بھی اپنے ذاتی کتب خانے قائم کر رکھے تھے جن کے دروازے علماء ومحققین کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔

عوامی کتب خانے

عالم اسلام کا کوئی بھی بڑا شہران کتب خانوں سے خالی نہیں تھا، بلکہ بعض شہروں میں کئی کئی عوامی کتب خانے قائم تھے، ان میں بغداد کا کتب خانہ "دار الحکمة" سب سے زیادہ مشہور ہوا، دوسرے مشہور کتب خانوں میں، مصر میں جامع ازہر کا کتب خانہ، دمشق میں "کتب خانہ ظاہریہ" تیونس میں "جامعہ زیتونہ" اور "قیروان" کے کتب خانے اور مراکش کے شہر "فاس" میں جامعہ قرویین کا کتب خانہ وغیرہ تھے، صلاح الدین ایوبیؒ کے عہد میں سیریا (شام) کے شہر آمد کے کتب خانے میں دس لاکھ چالیس ہزار کتابیں تھیں۔

استاد شوقی ابوخلیل لکھتے ہیں: چوتھی صدی ہجری میں حاکم (بامراللہ) نے قاہرہ میں بغداد کے طرز پر ایک عظیم الشان کتب خانہ "دارالحکمت" کے نام سے قائم کیا تھا جس میں ایک لاکھ جلدیں تھیں، بطلیموس کا بنایا ہوا "کرہ سماویہ" (Celestial Globe) بھی اس کتب خانہ کی زینت تھا۔

قاہرہ میں عزیز باللہ فاطمی کے قائم کردہ کتب خانے میں دس لاکھ ساٹھ ہزار کتابیں تھیں جن میں صرف ریاضیات پر چھ ہزار اور فلسفہ پر دس ہزار کتابیں تھیں۔

چوتھی صدی میں ہی قائم شدہ قرطبہ لائبریری میں چار لاکھ قلمی نسخے تھے، جن کی فہرست چوالیس ضخیم رجسٹروں میں تیار کی گئی تھی۔

حمٰی (شام) کے امیر ابوالفداء کے پاس ستر ہزار نادر اور بیش قیمت کتابیں تھیں۔

ول ڈیورانٹ (Will Durant) اپنی کتاب "تہذیب کی کہانی" (Story of Civilization) میں لکھتا ہے:

> "بخارا کے سلطان نے ایک مشہور طبیب کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی تو طبیب نے اس عذر کے ساتھ اس کی دعوت کو رد کر دیا کہ اسے اپنی کتابیں منتقل کرنے کے لیے چار سو اونٹوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس وقت یورپ کا حال یہ تھا کہ کتب خانے تو کجا کلیساؤں کے باہر بائبل بھی

دستیاب نہیں تھی'' ۔(۱)

دنیائے عرب کے علاوہ ترکی، ایران، ماوراء النہر اور ہندوستان میں بھی بے شمار ذاتی، عوامی، اور مساجد و مدارس میں کتب خانے قائم تھے۔

غیروں کے ذریعہ اسلامی کتب خانوں کی تباہی

(الف) مسلمانوں کی علمی میراث کو سب سے بڑا نقصان تاتاری غارت گری میں ہوا اور شاید انسانی تاریخ میں علم و دانش کے ساتھ کوئی دوسرا واقعہ اس قدر دہلا دینے والا پیش نہیں آیا، جاہل اور وحشی تاتاریوں نے اپنے راستے میں آنے والے تمام کتب خانوں کو تباہ و برباد کر دیا، صرف بغداد میں انہوں نے اتنی کتابیں دریائے دجلہ میں پھینک دیں کہ چالیس دن تک دریا کا پانی سیاہی مائل رہا، محمد کرد علی نے لکھا ہے:

> ''ہلاکو کے سپاہیوں نے کتابوں کے ذریعہ گھوڑوں کے اصطبل اور چارہ رکھنے کے لیے باڑے بنائے تھے'' ۔(۲)

(ب) اس سلسلہ کا دوسرا بڑا حادثہ ''سقوط غرناطہ'' کے وقت پیش آیا۔ اندلس کے ہر نشان کو مٹا دینے کی کوشش میں بے شمار کتب خانے جلا دیے گئے، سب سے بڑا واقعہ غرناطہ میں پیش آیا، کارڈینل کیسی ملنس (Cordnell Casy Millins) نے ۱۵۱۱ء میں شہر میں موجود ہر عربی کتاب کو جلا دینے کا حکم دیا۔ تمام کتابوں کو ''باب رحلت'' نامی میدان میں اکٹھا کر کے سپرد آتش کر دیا گیا، مشہور قول کے مطابق ان کتابوں کی تعداد دس لاکھ ستر ہزار تھی، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پورے اندلس میں مجموعی طور پر کتنا بڑا علمی سرمایہ ضائع ہوا ہوگا۔

(ج) مسلمانوں کی علمی میراث پر تیسری قیامت صلیبی جنگوں کی صورت میں نازل ہوئی، اسلامی کتب خانے صلیبی حملوں کا خاص نشانہ تھے، طرابلس شام کے مشہور کتب خانے بنو عمار کے علاوہ بیت المقدس، عسقلان، غزہ اور معرہ وغیرہ شہروں کے متعدد کتب خانے جلا دیے گئے، مؤرخین کے مطابق صرف طرابلس (اب لبنان میں واقع) کے مختلف کتب

(۱،۲) مضمون: مسلمانوں کی علمی میراث اور اس کی یورپ منتقلی، از سید علیم اشرف جائسی، مشمولہ رسالہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۷، شمارہ ۱۱، صفحہ ۲۱

خانوں میں جو کتابیں جلائیں گئیں ان کی تعداد تیں لاکھ کے قریب تھی، صلیبی حملے ۱۰۹۶ء سے ۱۲۹۱ء تک جاری رہے۔

(د) رومانیہ کے شہنشاہ شارک پنجم (Shark V) نے ۱۵۲۶ء میں جب تیونس (ٹیونیشیا) پر قبضہ کیا تو وہاں موجود تمام عربی کتابوں کو جلوادیا تھا۔

اندلس اور سسلی مسلمانوں کے دو ایسے علمی اور تہذیبی مرکز تھے جو خود یورپ میں قائم تھے، یہاں کی درسگاہیں اور یونیورسٹیاں ایک زمانہ تک عیسائی طلباء کی طواف گاہ بنی رہیں۔ جب ان دونوں مراکز سے مسلم اقتدار کا خاتمہ ہوا تو پسماندہ علمی میراث یورپ کے مختلف کتب خانوں میں منتقل ہوگئی۔

(و) اسی طرح صلیبی فوجوں نے مسلمانوں کے علمی سرمایہ کو لوٹا اور برباد کیا، ان حملوں میں فلسفہ، طب اور ریاضیات وغیرہ کی کتابیں یورپ پہنچادی گئیں، جب کہ حدیث تفسیر اور فقہ وغیرہ کی کتابوں کو نذر آتش کردیا گیا۔

کتب خانوں کا سرقہ

ان مہمات کے ذریعے نہ جانے کتنے نادرونایاب آثار اور علمی میراث کا کتنا بڑا حصہ مغربی عجائب خانوں اور لائبریریوں میں پہنچ گیا، ان طریقوں کو خواہ کوئی بھی نام دیا جائے لیکن یہ سب چوری ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

مذکورہ بالانظریئے کے ثبوت میں ''مشتے نمونہ ازخروارے'' کے طور پر چند دلیلیں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ مستشرق بوکوک نے حلب اور آستانہ میں تقریباً پانچ سال گزارا، اور اس عرصہ میں وہ عربی مخطوطات کا ایک نادر مجموعہ جمع کرکے برطانیہ لے گیا جو آج بھی آکسفورڈ میں واقع Bodlian لائبریری کا قیمتی حصہ ہے۔

۲۔ مستشرق جوہان بورک ہارٹ (Johann Burckhardt) نے مصر، شام، لبنان، اور سوڈان وغیرہ میں اپنے اسفار کے دوران قلمی نسخوں کا ایک بڑا ذخیرہ اکٹھا کیا جو کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری میں اب بھی موجود ہے۔

۳۔ ۱۷۶۲ء میں بابا فرحات مشرقی نے اسپین کا دورہ کیا اور قلمی نسخوں کی ایک بڑی تعداد لے کر واپس ہوا۔

۴۔ اسپین کے شہنشاہ فلپ دوئم (Phillipe II) نے بڑے پیمانے پر عرب ممالک سے مخطوطات منگوائے اور یہی قلمی نسخے مشہورزمانہ اسکوریال لائبریری (Escorial) کا سنگ بنیاد بنے۔

۵۔ لبنان کے سمعانی خاندان کے ذریعہ ویٹکن نے ہزار ہا ہزار عربی مخطوطات اپنی لائبریری کے لیے منگوائے، بابائے اعظم کلے مین (Clayman) نے ۱۷۱۵ء میں اسی خاندان کے ایک فرد یوسف سمعانی کے ذریعہ عالم عرب سے دو ہزار بیش قیمت مخطوطے حاصل کیے۔

الف: رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں چار لاکھ قلمی نسخے ہیں جن میں بڑی تعداد عربی اور اسلامی مخطوطات کی ہے۔

ب: برٹش میوزیم لائبریری کی فہرست مخطوطات دو ضخیم جلدوں میں ہے، اور ۱۴ ہزار سے زائد مخطوطات پر مشتمل ہے، لائبریری تین شعبوں میں منقسم ہے، تیسری قسم میں وہ کتابیں اور قلمی نسخے ہیں جن کا تعلق مراکش سے لے کر جاپان تک ہے۔

ج: آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں عربی وفارسی مخطوطات کے بڑے بڑے ذخیرے ہیں، ان میں ڈچ مستشرق اربانیوس کا وہ مجموعہ بھی ہے جس میں ۸۵ بے حد نایاب قلمی نسخے ہیں۔ مستشرق لار (Lar) کے تین مجموعے بھی انہی میں شامل ہیں، جن کے مخطوطات کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔

۴۔ درہم یونیورسٹی (Durham University) میں عربی مخطوطات کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ مشہور اطالوی مستشرق گبریل (Gabriel) نے اٹلی کے مختلف کتب خانوں میں موجود عربی مخطوطات کی ایک فہرست تیار کی ہے جو پندرہ ہزار مخطوطات پر مشتمل ہے، یہ اٹلی کے ۵۹ شہروں کی ۱۱۸ لائبریریوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

استاذ عبدالرحمٰن حسن میدانی کے مطابق یورپین کتب خانوں میں موجود عربی

مخطوطات کی تعداد انیسویں صدی کے اوائل میں ڈھائی لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔

تمدن وحسن انتظام کی خوبی

تمدن وحسن انتظام میں مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں بڑا مقام پیدا کیا تھا، جو آج کے متمدن دور سے کم نہیں بلکہ بڑھا ہوا نظر آتا ہے، اس کی بعض تفصیلات بطور نمونہ ذیل میں پیش ہیں:

عبدالرحمٰن ثالث کے زمانہ میں اسلامی اندلس کا پایۂ تخت قرطبہ تہذیب وتمدن کی بلندیوں پر تھا، رات کے وقت چراغوں سے پورا شہر جگمگا اٹھتا تھا، راہ گیر دس میل (۱۶کلومیٹر) اس کی روشنی میں چل لیتا تھا اور کہیں سے روشنی غائب نہ ہوتی، اس کی گلیاں بلاط کے قیمتی ٹائلس سے مزین اور اس کی سڑکیں کوڑا کرکٹ سے پوری طرح پاک تھیں، اس کے اردگرد ہرے بھرے گھنے باغات تھے، آنے والا شہر میں داخل ہونے سے پہلے کئی گھنٹے ان چمن زاروں سے جی بہلاتا، اس کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ تھی (یہ اس زمانہ کی بات ہے جب یورپ کے بڑے سے بڑے شہر کی آبادی بھی پچیس ہزار سے زیادہ نہ تھی) اس میں نوسو حمام خانے، دو لاکھ تراسی ہزار مکانات، اسی شاندار محل اور چھ سو مسجدیں تھیں، اس کا دائرہ تیس ہزار گز تھا، اس کا ہر باشندہ تعلیم یافتہ تھا، اس کی صرف ایک سمت یعنی مشرقی حصہ میں ایک سوستر ایسی خواتین تھیں جو ہر وقت خط کوفی میں مصاحف لکھنے میں مشغول رہتیں، اس میں اسی مدارس تھے جہاں غریب لوگ مفت تعلیم پاتے تھے، اور پچاس اسپتال تھے۔

اس کی مسجد آج تک فن تعمیر کی زندہ جاوید نشانی ہے، اس کے اذان خانے کی بلندی چالیس گز تھی، اس کا باریک گنبد چھید دار لکڑی کے ستونوں پر قائم تھا جس کو مختلف قسم کے ایک ہزار ترانوے سنگ مرمر کے ستون سہارا دیے ہوئے

تھے جو شطرنج کی بساط کی طرح معلوم ہوتے تھے، ستونوں کی اس ترتیب سے لمبائی میں انیس اور چوڑائی میں اڑتیس صحن بنتے تھے، اس مسجد میں رات کے وقت چار ہزار سات سو چراغ روشن کیے جاتے جس میں ہر شب میں بارہ سیر تیل خرچ ہوتا، مسجد کے جنوبی رخ پر پٹرے چڑھائے ہوئے انیس دروازے تھے جو عجیب وغریب انداز سے بنائے گئے تھے، اور بیچ کے دروازے پر سونے کی تختیاں لگائی گئی تھیں، مشرقی اور مغربی سمت میں ان دروازوں سے ملتے جلتے نو دروازے اور تھے، جہاں تک اس کی محراب کا تعلق ہے تو وہ تعریف سے بالاتر ہے، انگریز مؤرخ کی یہ بات کافی ہے کہ یہ سب سے حسین وجمیل چیز ہے جس پر کسی انسان کی نظر پڑی ہو، اس سے زیادہ خوبصورت چیز نہیں دیکھی گئی، نہ قدیم میں نہ دور جدید میں۔

اس میں ایسی حسین وجمیل، دلکش، جاذب نظر اور عجیب وغریب چیزیں تھیں جو بالخصوص اس زمانہ کے اعتبار سے ذہن رسا سے بالاتر تھیں، دیکھنے والا چونک جاتا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہتی اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا کہ دنیا میں ایسا خوبصورت کوئی محل نہیں ہے۔

قرطبہ کے ترقیاتی حالات کے ساتھ قصر زہراء کا بھی تذکرہ قابل ذکر ہے جو دلکشی وجاذبیت کی وجہ سے تاریخ کے صفحات مین پائیدار ہے، یہاں تک کہ ترکی مؤرخ ضیا پاشا نے لکھا ہے کہ یہ ایسا نادرۂ روزگار ہے جس کی نظیر ابتدائے آفرینش سے کسی عمارت ساز کے ذہن میں نہیں آئی اور نہ ہی کسی انجینئر کی عقل وفکر میں اس کی تصویر ابھری جب سے عقل وخرد کا وجود ہے، زہراء کی تعمیر میں چار سال لگے تھے، زمین پہ لگے ہوئے پتھروں کے علاوہ جو پتھر ہر روز بنائے جاتے تھے ان کی تعداد چھ سو تھی، اور ہر دن کام کرنے والے دس ہزار تھے اور اس میں ہر روز چودہ سو خچروں سے کام لیا جاتا، ہر تین دن پر گیارہ سو ہودج سے بھرا ہوا چونا اور گچ آتا۔ جہاں تک زہراء کی جامع

مسجد کا تعلق ہے تو اس میں ہر روز ایک ہزار ماہر کاریگر کام کرتے تھے، جن میں سے تین سو مستری ہوتے، دو سو بڑھئی اور پانچ سو مزدور اور دوسرے کاریگر، اس کی تعمیر صرف اڑتالیس دن میں مکمل ہوئی تھی، اور یہ ایسی سرعت وجلدی کے ساتھ ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اس شاندار محل میں خلیفہ مستنصر نے ۳۵۱ھ میں اسپین کے بادشاہ اردون بن ازفونش کو استقبالیہ دیا، جب وہ زہراء میں داخل ہوا اور اس کی شان وشوکت، حشم وخدم، ہتھیار اور سپاہیوں کو دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس کا کروفر دیکھ کر دنگ رہ گیا، اس کی آرائش وزیبائش سے اس کی آنکھیں پھٹی اور کمر جھکی جارہی تھی، اور فرط حیرت سے سیدھے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا، وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ زندگی میں اس کی ایک مرتبہ زیارت نصیب ہوئی، اس کے روئیں روئیں سے تشکر واحسان مندی کے چشمے ابل رہے تھے۔

پھر جب وہ خلیفہ کی نشست گاہ پہ پہونچا جس کے ایک طرف اعیان مملکت اور بڑے بڑے فاضل وقابل علماء وخطباء اور سپہ سالار تھے تو وہ اور بھی ششدر ہوا، پھر جب اسپین کا بادشاہ خلیفہ مستنصر سے قریب ہوا تو اپنا سر کھول لیا، ٹوپی اتارلی، اور کھلے سر رہا، یہاں تک کہ خلیفہ نے قریب ہونے کی اجازت دی، پھر جب وہ خلیفہ کے بالمقابل کھڑا ہوا تو کچھ دیر کے لیے سجدہ ریز ہوگیا، پھر سیدھا کھڑا ہوا، پھر چند قدم آگے بڑھا پھر دوبارہ سجدے میں گر پڑا، یہ عمل کئی بار کیا، یہاں تک کہ خلیفہ کے سامنے آگیا، اور ان کے ہاتھ کا بوسہ لینے کی غرض سے بڑھا تو خلیفہ نے ہاتھ بڑھادیا، پھر وہ ایڑی کے بل پر خلیفہ کی جانب پشت کیے بغیر پچھلے پاؤں واپس ہوا، پھر ایک تخت پر بیٹھا جو خاص طور سے اسی کے لیے تیار کیا گیا تھا، مستنصر نے کہا کہ ”آپ کا آنا مبارک ہو، اور آپ کے لیے فرحت بخش ثابت ہو، آپ کی آرزوئیں پوری ہوں اور آپ مسرور ہوں، ہمارے پاس اس سے کہیں زیادہ ہے

جوآپ کے خیال میں رہا ہوگا۔" جب خلیفہ کی بات کا ترجمہ کیا گیا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا اور اپنی کرسی سے نیچے اتر کر فرش کو بوسہ دیا پھر کہاں میں غلام ہوں، امیر المؤمنین میرے آقا ہیں، جو فضل و احسان میں اپنی مثال آپ ہیں اور عظمت و بزرگی کے مقام بلند پہ فائز ہیں، اپنے اور ماتحتوں کے بارے میں بڑے پختہ ہیں، اپنے فضل سے مجھے جو مقام دیں اور اپنی خدمت کا موقع دیں آپ کا احسان ہے، میری خواہش ہے کہ میں آپ کو کچھ مشورہ دوں اور خیر خواہی کی بات کہوں۔ خلیفہ نے ان سے کہا، آپ کا مقام ہمارے نزدیک ایسے شخص کا ہے جو ہماری بہتر رائے کا مستحق ہے، اور حسن رائے رکھتا ہے، اور ہم آپ کو آپ کی قوم پر وہ فوقیت اور ترجیح دیں گے جو آپ کو خوش کر دے گی، اور جس کے ذریعہ آپ ہماری جانب اپنے میلان اور ہمارے ظل سلطانی سے سایہ لینے کی اہمیت کو جان لیں گے۔

جب ہم وہاں سے غرناطہ گئے تو ہم پر فن تعمیر کی عظمت قصر الحمراء کی شکل میں آشکارا ہوئی، یہ ایک نادر اور عجیب وغریب نمونہ ہے، جس کے زائرین دہشت زدہ رہ جاتے ہیں، مرور زمانہ کے باوجود یہ قصر دنیا بھر کے زائرین کا مرکز توجہ بنا ہوا ہے، یہ قصر ایک پہاڑ کی ڈھلوان پہ ہے جہاں سے غرناطہ کا پورا شہر اور آس پاس کے وسیع وعریض لہلہاتے سبزہ زار نظر آتے ہیں، یہ دنیا کی تمام جگہوں سے خوبصورت اور دیدہ زیب لگا۔ اس میں کئی ہال ہیں جن میں سے قاعة الأسود، غرقة الأختين، قاعة العدل، اور قاعة السفراء وغیرہ ہیں، اس مختصر سے بیان میں ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کہ پورے طور پر حمراء کی منظر کشی کریں، ہمارے لیے اس کے سلسلہ میں فرانس کے شاعر "فیکتو رہوجو" نے جو کہا ہے وہی کافی ہے۔

"اے حمراء، اے حمراء، اے وہ محل کہ تم کو ملائکہ نے اپنے خیال کے مطابق زینت بخشی اور تمہیں ہم آہنگی کی مثال بنا دیا، اے معزز و خوبصورت پھولوں

اور ٹہنیوں جیسے نقش ونگار سے سجے ہوئے قلعے! تو اس طرح جھکا ہوا ہے لگتا ہے کہ گرنے کے قریب ہے جب ماہتاب کی سیمیں کرنیں تمہاری دیواروں پر تمہارے عربی ڈیزائن کے دریچوں سے عکس ڈالتی ہیں تو رات میں ایک سحر انگیز آواز سنائی دیتی ہے۔"

جہاں تک اندلس کے دوسرے شہروں اوران کی عظمت وسربلندی کا تعلق ہے تو یہ ایسا موضوع ہے جو بہت طویل ہے، ہم یہاں صرف اشبیلہ کا ذکر کر رہے ہیں، جس میں صرف ریشمی کپڑا بننے کے لیے چھ ہزار پاور لوم ہیں، یہ شہر اپنے چہار جانب سے زیتون کے پیڑ سے گھرا ہوا ہے، اسی وجہ سے وہاں ایک لاکھ زیتون کا تیل نکالنے کے کارخانے ہیں۔

عام طور پر اسپین کے شہر آباد ہیں، ہر شہر مختلف صنعتوں میں مشہور ہے، یورپ بہت دلچسپی سے متوجہ ہوتا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہے، حتی کہ یہ زرہ، خود اور فولاد پر پانی چڑھانے کی فیکٹریوں میں مشہور ہے، یورپ والے ہر جانب سے اس کے خریدنے کے لیے آتے ہیں، رینو اپنی کتاب "الغارۃ علی فرنسا" میں رقمطراز ہے: "عربوں نے جب اندلس سے فرانس کے جنوب پر حملہ کیا اور انھوں نے سمح خولانی، عیسہ کلبی اور حر تقفی کی قیادت میں اربونہ، فرتشونہ، افینون اور لیوں کو فتح کرلیا، اس وقت وہ سب اس طرز کے ہتھیاروں سے لیس تھے کہ اس کی نظیر فرانسیسیوں میں نہیں ملتی۔

اس کے بعد ہم عالم اسلامی کی مشرقی جانب چلتے ہیں، تاکہ ہم اس کے بڑے شہر اور اس کی دلکش تہذیب وثقافت کی مثالیں دیکھیں، میں یہاں صرف بغداد پہ اکتفاء کرتا ہوں جب اس کو آباد کیا گیا تو وہ کس طرح دنیا کے عجائبات میں سے تھا جس کی نظیر زمانہ قدیم میں نہیں ملتی۔

مشہور عباسی خلیفہ منصور کے بغداد بسانے سے قبل بغداد بہت مختصر اور چھوٹی سی اناج کی منڈی تھا، وہاں ہر سال کے آغاز میں قریبی جگہوں کے تاجر جمع

ہوتے تھے، جب منصور نے اس کو بنانے کا ارادہ کیا تو انجینئروں اور عمارت سازی، کھیتی باڑی، پیائش اور آراضی کی تقسیم سے واقف کاروں کو بلایا پھر اس کی بنیاد کے موقع پر پہلی اینٹ خود اس نے اپنے ہاتھ سے رکھی اور کہا: "بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم والحمد للّٰہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین"۔ (اس اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور بہت رحیم ہے، اور تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، وہ بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا وارث بناتا ہے، اور انجام کار متقیوں کے لیے ہے)

پھر کہا "ابنوا علیٰ برکۃ اللّٰہ" اللہ کی برکت سے تعمیر شروع کرو، اس کی تعمیر میں زرِ کثیر صرف ہوا یعنی چار ملین آٹھ لاکھ درہم، اس میں کام کرنے والوں کی تعداد ایک ہزار تھی، اور اس کی تین فصیلیں تھیں جو ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں، اس کی آبادی دو ملین تھی، مشرقی جانب اس کے راستوں اور گلیوں کی تعداد چھ ہزار اور مغربی جانب چار ہزار تھی، اور وہاں دجلہ وفرات کے علاوہ گیارہ دوسری چھوٹی نہریں تھیں، ان کا پانی بغداد کے تمام گھروں اور محلوں میں پہنچتا تھا، صرف دجلہ میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر جانے کے لیے تیس ہزار کشتیاں تھیں، یہاں کے حمام کی تعداد ساٹھ ہزار تھی، عہد عباسی کے اواخر میں یہ تعداد گھٹ کر لگ بھگ بیس ہزار رہ گئی، مسجدوں کی تعداد تین لاکھ تھی، اس کے باشندوں اور علماء وادباء اور فلاسفہ کی اتنی کثرت تھی جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے، ہم یہاں خطیب بغدادی کی وہ بات نقل کر رہے ہیں جو انہوں نے اس کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھی ہے۔ "ایک طرف یہ ہے تو دوسری طرف ہم اس کے بہت سے مناقب کو ترک کر رہے ہیں جس میں پوری دنیائے مشرق ومغرب میں خدا نے اسے امتیاز بخشا ہے، اور اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ وہ اخلاق فاضلہ اور اوصاف جمیلہ شیریں اور رواں چشمے، کثیر تعداد میں عمدہ وپختہ پھل، دلکش مناظر، ہر فن میں مہارت، ہر ضرورت کی فراہمی، بدعتوں کے ظہور سے

- امن، علماء و متعلمین وفقہاء و متفقہین، رؤساء و متکلمین، حساب ونحو کے ماہرین، بہترین قادر الکلام شعراء، تاریخ وانساب، فنون وآداب کے واقف کاروں کی کثرت، غرض ہر اچھی چیز کی دستیابی اور مختلف موسموں کے پھلوں کی ایک وقت میں موجودگی کہ دنیا کے کسی شہر میں کوئی ایسا پھل نہیں پایا جاتا تھا جو یہاں نہ ملتا ہو، بالخصوص موسم خریف میں یہ سب چیزیں تھیں، جس کی وجہ سے اس کا سر سب سے اونچا تھا، پھر اگر کسی شہری کے لیے رہنے کی جگہ تنگ پڑتی تو اس سے اچھی جگہ مل جاتی اور اگر اسے کوئی مکان کسی جانب اپنے مکان سے اچھا نظر آتا تو اس میں منتقل ہونے میں اسے کسی طرح کی کوئی دشواری نہ ہوتی، بلکہ بڑی آسانی کے ساتھ وہ اپنے مقصود کو پالیتا تھا، اور جب وہ اپنے دشمن سے راہ فرار اختیار کرتا تو کہیں بھی دور و نزدیک اسے پناہ مل جاتی، اور اگر وہ پسند کرتا کہ ایک گھر کو دوسرے گھر سے یا ایک راستے کو دوسرے سے راستے ایک سڑک کو دوسری سڑک سے یا ایک گلی کو دوسری گلی سے بدلے تو حسب موقع اس کے لیے ممکن ہوتا، پھر ایک طرف اس کے بڑے بڑے تجار، باشوکت سلاطین اور معزز گھرانے کے لوگ تھے، جو مسلسل بلا ناغہ ان لوگوں کو مال فراہم کرتے جو ان سے کم درجہ کے لوگ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ پورا بغداد اللہ کے ان عظیم خزانوں میں سے ہے جس کی حقیقت سے وہی آشنا تھے۔

مزید لکھتے ہیں: عظمت وبلندی، علماء ودانشمندوں کی کثرت، خواص وعوام میں امتیاز، اس کے علاقہ کی وسعت اس کی وادیوں اور ساحل کی کشادگی، گھروں اور رہائش گاہوں، گلی کوچوں اور گھاٹیوں، بستیوں اور بازاروں، سڑکوں اور گزرگاہوں، مساجد اور غسل خانوں، عمدہ کپڑے کی بنائی کے کارخانوں اور تجارتی منڈیوں اور دکانوں کی کثرت، ہوا کی نرم خرامی، پانی کی شیرینی، سایوں کی ٹھنڈک وخنکی، موسم سرما وگرما کا اعتدال، موسم بہار

وخزان کا توازن، باشندوں کی کثرت اور گہما گہمی، اس دنیا میں بغداد کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ رشید کے دور میں اس کی آبادی سب سے زیادہ تھی جب کہ پورا بغداد اطمینان کی نیند سوتا تھا اور ہر طرف راحت وآرام تھا، اس کی چراگاہیں سرسبزی وشادابی سے لہلہارہی تھیں اور اس کے گھاٹ پر بھیڑ لگی ہوتی تھی، پھر فتنے ومصائب رونما ہوئے اس کے باشندوں پر مسلسل آزمائشیں وبلائیں آتی رہیں، تو اس کی آبادی، بربادی میں تبدیل ہوگئی، اور باشندے منتقل ہوگئے، مگر ہمارے اس زمانے سے قبل تک وہ اپنی ساری خرابیوں اور بربادیوں کے باوجود دوسرے علاقوں سے مختلف اور سارے شہروں سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔

ہم اپنی بات مقتدر باللہ کے عہد میں اس کی عظمت وبلندی اور اس کے زمانہ خلافت میں اس کی شان وشوکت کے تذکرے پر ختم کریں گے، جب رومن امپائر کے فرستادہ نے اس کی زیارت کی، اس وقت دارالخلافہ اپنی وسعت میں آج کے سیریا کے بڑے سے بڑے شہر سے فائق تھا، وہاں خدمت گزار کی حیثیت سے گیارہ ہزار خواجہ سرا تھے، اور ان کے علاوہ ہزاروں ایسے تھے جن کا کوئی شمار نہیں، اور ہر باری میں فراشوں (جاروب کشوں) کی تعداد چار ہزار تھی، جب رومن امپائر کا قاصد آیا تو اس کو مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا، پھر مہمان خانہ سے خلیفہ کے محل تک لشکر کی ترتیب دی گئی ان کی تعداد پیدل وسوار کے بشمول ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی، وہ ان کے درمیان چلا، یہاں تک کہ محل تک پہونچ گیا، وہاں سات ہزار خادم، سات سو پہرہ دار اور چار ہزار کالے غلام تھے، خزانے کھول دیے گئے، ہتھیار اور سامان حرب وضرب ترتیب وار کسی دلہن کے سامان کی طرح سجا ہوا تھا، جب رومن امپائر کا قاصد دارالشجرہ میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر وہ ہوش وحواس کھو بیٹھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ جب رومن قاصد نے دارالخلافہ کی عظمت اور ہیبت

وجلال کو دیکھا تو وہ آخری حدتک مبہوت ہوگیا اور اس کے اوسان خطا ہوگئے، کیونکہ اس وقت دنیا میں اس طرح کا کوئی محل نہیں تھا جو اس نے یہاں دیکھا تھا، ہمارے لیے بس اتنا ہی ذکر کرنا کافی ہے تا کہ ہم اپنی تہذیب وتمدن کے ابتدائی دور میں اس کے رعب وجلال اور عظمت وشوکت کا کچھ اندازہ کرسکیں۔(۱)

علاج ومعالجہ کا اہتمام اور شفاخانوں کا اعلیٰ انتظام

جہاں تک شفاخانوں کا تعلق ہے تو قصبات وشہران سے بھرے ہوئے تھے بلکہ اس زمانہ میں عالم اسلام کے چھوٹے سے چھوٹے شہر میں بھی ایک سے زیادہ شفاخانے ہوتے تھے،صرف قرطبہ کے شفاخانوں کی تعداد پچاس تھی۔

متعدد اقسام کے شفاخانے تھے، ایک قسم فوجی ہسپتال کی تھی جہاں مخصوص وماہر اطباء اپنی خدمات انجام دیتے تھے،خلیفہ، قائدین اور امراء کے اطباء ان سے مختلف تھے، اسی طرح قیدیوں کے شفاخانے بھی الگ تھے، جہاں ہرروز اطباء آکر ضروری دواؤں سے بیماروں کا علاج معالجہ کرتے تھے، وزیر علی بن عیسیٰ بن الجراح نے رئیس الاطباء سنان بن ثابت کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ’’قیدیوں کے معاملہ میں سوچ بچار سے کام لے کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ اپنی بڑھتی ہوئی تعداد اور جگہوں کے راس نہ آنے کے باعث مختلف امراض سے دوچار ہوتے ہیں، تو مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے لیے مخصوص اطباء رکھیں جو ہرروز وہاں جایا کریں، اور دوائیں اور ٹانک بھی وہاں پہنچائی جائیں، یہ اطباء تمام جیل خانوں کا دورہ کریں اور بیماروں کا علاج کریں۔(۲)

ابتدائی طبی امداد پہونچانے کے لیے بھی دواخانے تھے جو خصوصاً جامع مسجدوں

(۱) من روائع حضارتنا از ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی صفحہ ۲۷۲-۲۸۳ (۲) ایضاً صفحہ ۲۲۲

اوران پبلک نشست گاہوں کے قریب ہوتے تھے جہاں عام لوگوں کی بھیڑ رہتی تھی، مقریزی نے ذکر کیا ہے کہ جب ابن طولون نے مصر کی مشہور جامع مسجد کی تعمیر کی تو اس کے پیچھے کی طرف ایک وضوخانہ اور دواخانہ بنایا جہاں ہر قسم کی ٹانکیں اور دوائیں مہیا تھیں جہاں خدمت گزار بھی متعین تھے، ہر جمعہ کو ایک طبیب آ کر اس میں بیٹھتا تھا اور نمازیوں میں سے جو حضرات بیمار ہوتے ان کا علاج کیا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ پبلک ہسپتال بھی تھے، جن کے دروازے عوام کے لیے کھلے رہتے تھے، مردوں کے لیے الگ اور خواتین کے لیے الگ انتظام تھا اور ہر شعبہ کے متعدد ہال تھے اور ہر ہال کسی خاص بیماری کے لیے مخصوص تھا، کوئی داخلی بیماریوں کے لیے، کوئی امراض چشم کے لیے، کوئی سرجری کے لیے، کوئی ہڈی وغیرہ کو جوڑنے کے لیے اور کوئی دماغی بیماریوں کے لیے تھا، داخلی بیماریوں کا شعبہ کئی کمروں پر مشتمل تھا، کوئی بخار کے لیے، کوئی اسہال اور پیچش کے لیے، اسی طرح اور دوسری بیماریوں کے لیے مخصوص کمرے تھے، اور ہر ڈپارٹمنٹ کے لیے چند مخصوص اطباء تھے جن کا ایک ہیڈ ہوتا تھا، چنانچہ داخلی بیماریوں کے لیے ایک سربراہ، سرجنوں کا ایک سربراہ اور جوڑ بٹھانے والے ڈاکٹروں کا ایک سربراہ اور ماہرین امراض چشم کا ایک سربراہ تھا، اور ہر ڈپارٹمنٹ پر چیف نگراں کی حیثیت سے ایک ڈاکٹر مامور ہوتا تھا جس کو ''ساعور'' کہتے تھے، اسپتالوں میں رئیس الاطباء کا یہی لقب تھا، ڈاکٹر باری باری سے اپنی خدمت انجام دیتے تھے، ہر ڈاکٹر کا متعین وقت تھا جس میں وہ ان ہالوں میں موجود ہوتا جہاں بیماریوں کا اسے علاج کرنا ہوتا تھا، ہر ہسپتال میں جاروب کشوں کا بھی ایک عملہ ہوتا تھا جس میں مرد بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی، اسی طرح تیماردار، کمپاؤنڈر اور ہیلپر بھی ہوتے تھے اور ہر ایک کو معقول تنخواہ بھی ملتی تھی، اور ہر اسپتال میں دواؤں کی ایک دوکان ہوتی جس کو ''خزانۃ الشراب'' کہا جاتا تھا، اس میں مختلف قسم کی دوائیں اور معجون ہوتے اور ایسی ایسی نادر جڑی بوٹیاں جو صرف وہیں دستیاب ہوتی تھیں، اسی طرح سرجری کے آلات اور کانچ اور مٹی کے برتن بھی ہوتے تھے اور ایسی چیزیں ہوتی تھیں جو بادشاہ کے خزانوں میں بھی نہیں ملتی تھیں۔

یہ اسپتال میڈیکل کالج کی بھی حیثیت رکھتے تھے، ہر ہسپتال میں لکچرز کے لیے ایک

بڑا سا ہال تھا جس میں ایک ماہر اسپیشلسٹ ڈاکٹر بیٹھتا، اس کے ساتھ دوسرے ڈاکٹر اور طلبہ ہوتے، اور ان کے دائیں بائیں علاج معالجہ کے اوزار اور کتابیں رکھی ہوتی تھیں، طلبہ مریضوں کا جائزہ لینے کے بعد استاد کے روبرو بیٹھتے، پھر استاد اور شاگردوں کے درمیان طبی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا، اور طبی کتابیں پڑھی جاتیں، اور اکثر ایسا ہوتا کہ استاد شاگردوں کو اپنے ساتھ وارڈ کے اندر لے جاتا تاکہ ان کے سامنے مریضوں پر عملی کارروائی کرے تاکہ ان کو تجرباتی فائدہ ہو، جیسے آج کل میڈیکل کالجوں میں رواج ہے۔

ابن ابی اصبعہ (جو کہ خود ایک ماہر طبیب تھے انہوں نے دمشق کے ''بیمارستان نوری'' (نوری ہسپتال) میں طب کی تعلیم پائی تھی) نے لکھا ہے:

> ''حکیم مہذب الدین اور حکیم عمران ہسپتال میں مقیم بیماروں کے علاج سے جب فارغ ہوتے جب کہ میں ان کے ساتھ ہوتا تھا، اس کے بعد میں حکیم شیخ رضی الدین رجبی کے ساتھ بیٹھ جاتا اور بیماریوں کی تشخیص کا طریقہ اور جو نسخے وہ ان کے لیے تجویز کرتے تھے، اس کا معائنہ کرتا اور بہت سی بیماریوں اور ان کے علاج کے سلسلہ میں تبادلۂ خیال کرتا تھا'' (۱)

رئیس الاطباء کے سامنے امتحان دینے سے قبل کسی طبیب کو معالجہ کی اجازت نہیں تھی، امتحان کا طریقہ یہ تھا کہ رئیس الاطباء اس فن کی جس میں وہ اجازت حاصل کرنا چاہتا تھا کسی بڑے طبیب کا کوئی رسالہ جس پر اس کی تعلیقات اور حواشی ہوتے اس طبیب کے سامنے پیش کرتا اور اس فن سے متعلق ساری چیزوں کے بارے میں اس کی جانچ کرتا، جب وہ ٹھیک سے جواب دیتا اور امتحان میں کامیاب ہوتا تو اس کو سند دیتا کہ وہ طب وحکمت کا پیشہ اختیار کرسکتا ہے، خلیفہ عباسی مقتدر باللہ کے زمانہ میں ۳۱۹ھ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی طبیب کی غلطی سے ایک شخص کی جان چلی گئی، تو خلیفہ نے آئندہ کے انسداد کے لیے رئیس الاطباء سنان بن ثابت کے نام یہ حکم صادر کیا کہ تمام اطبائے بغداد کا از سرِ نو امتحان لیا جائے، ابن ثابت نے فرمان خلافت کی تعمیل میں کل اطبائے بغداد کا امتحان لیا تو صرف بغداد کے اطباء کی

(۱) من روائع حضارتنا از ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی صفحہ ۲۲۴

تعداد آٹھ سو ساٹھ سے زائد تھی، مزید برآں وہ اطباء اس شمار سے خارج ہیں، جو بوجہ شہرت فضل وکمال امتحان سے مستثنیٰ رہے یا جن کا دربار خلافت سے تعلق تھا اور وہ خلیفہ وزراء اور امراء کے معالجین تھے۔

چلتے چلتے اس کا بھی ذکر کر دیں کہ ہر ہسپتال سے متصل طبی کتابوں اور ان ساری کتابوں (جن کی اطباء اور ان کے شاگردوں کو ضرورت پڑتی تھی) سے بھرپور ایک کتب خانہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ قاہرہ میں ابن طوبون کے اسپتال میں ایک کتب خانہ تھا جس میں مختلف علوم کی ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں تھیں۔

ہسپتالوں میں انٹری بالکل فری تھی، مالدار، غریب، شہری، پردیسی، مشہور ومعزز اور گمنام کسی کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا، ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ ہوتا تھا، ہسپتال سے باہر ہال میں اولاً مریضوں کی جانچ کرائی جاتی، مرض ہلکا ہوتا تو نسخہ لکھ دیا جاتا اور ہسپتال کے دواخانہ سے اس کو دوا دلا کر بھیج دیا جاتا، لیکن مریض کی حالت اگر اتنی نازک ہوتی کہ ہسپتال میں بھرتی کرنا ضروری ہوتا تو پہلے اس کی انٹری کر دی جاتی، پھر اس کو حمام خانہ لے جایا جاتا اور کپڑے اتار کر مخصوص الماری میں رکھے جاتے، پھر عمدہ بستر بچھی ہوئی چارپائی دی جاتی، پھر ڈاکٹر جو دوا تجویز کرتا اور اس کی صحت کے موافق جو غذا جتنی مقدار میں بتاتا وہ دی جاتی، مریض کی غذا عموماً گائے، بکری، پرندے اور مرغی کے گوشت پر مشتمل ہوتی، اور جب ایک وقت میں پوری چپاتی اور پوری مرغی کھالیتا تو سمجھا جاتا کہ مریض اچھا ہو گیا، یہی شفایابی کی علامت تھی، جب نقاہت کی حالت میں ہوتا تو اس ہال میں داخل کیا جاتا جو ایسے ہی لوگوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا یہاں تک کہ جب مکمل شفایاب ہو جاتا تو ایک نیا جوڑا اور اتنا پیسہ دیا جاتا جو اچھی طرح کام کرنے کی قدرت پیدا ہونے تک اس کی کفایت کر سکے۔

ہسپتال کے کمرے بالکل صاف ہوتے جس میں پانی جاری ہوتا تھا اور اس کے ہالوں میں خوبصورت ترین فرش بچھے ہوتے، ہر ہسپتال میں صفائی کی جانچ پڑتال کرنے والے اور مالی معاملات کی نگرانی کرنے والے افراد متعین تھے، اور اکثر اوقات خلیفہ یا امیر خود مریضوں کی عیادت کرنے جاتا تھا اور ان کی حالت دریافت کرتا تھا، اور ان کے ساتھ

اچھا سلوک کرنے پر پوری نگرانی رکھتا تھا۔

عالم اسلامی کے سارے ہسپتالوں میں یہی نظام رائج تھا، خواہ مغرب میں ہوں یا مشرق میں، بغداد، دمشق، قاہرہ، بیت المقدس، مکہ، مدینہ، مغرب اقصیٰ اور اندلس ہر جگہ کا یہی حال تھا۔

مغربی اقوام کی پسماندگی اور تمدنی بے مائیگی

ساتویں صدی اور اس سے قبل افریقہ اور ایشیا کے سارے علاقوں میں جہاں رومیوں یا بازنطینیوں کا اقتدار تھا طب سے شدید نفرت پائی جاتی تھی، اور دینی اعتبار سے کسی مرض کے لیے دوا کے استعمال کو نامناسب عمل تصور کیا جاتا تھا، مرض پر قابو پانا یا اس سے چھٹکارا دلانا طبیب کا کام نہ تھا، بلکہ یہ فریضہ کاہنوں، جادوگروں، یا پھر عبادت گاہوں میں رہنے والے دینی رہنماؤں کا تھا، بعض یورپین مورخین نے لکھا ہے کہ رومن سلطنت کے زوال کے بعد کئی سو سال تک کلیسا نے یونانی طبی علم کو جاہلیت (Heathen) سے تعبیر کر کے الحاد بتایا اور امراض کے علاج کے لیے صرف روحانی علاج کی اجازت دی۔

علاج و معالجہ کے سلسلہ میں یورپ کا حال فارس، عراق، شام و مصر سے زیادہ خراب تھا، وہاں تو سوائے جادو، ٹونا اور گنڈہ، تعویذ کے مرض سے نجات پانے کا کوئی دوسرا طریقہ ہی نہ تھا، طبی علاج کرنے والے سزا کے مستحق قرار دیئے جاتے، ڈونالڈ کیمبل (Donald Cambell) نے اپنی کتاب Arabian Medicine - 1926 میں یورپ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:۔(۱)

> "During the period of Islamic Science, Europe was in Dark Ages and evels of pedantry, bigotry, cruelty,charms, amulets and relics were common there."

---

(۱) احادیث میں مذکور نباتات، ادویہ اور غذائیں - ایک سائنسی جائزہ۔ از ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی، صفحہ ۲۳

(اسلامی سائنس (کے فروغ) کے دور میں یورپ تاریکی کے دور سے گزر رہا تھا، جہل کی برائیاں کٹرپن، ظلم، جادو، ٹونا اور تعویذ عام تھے)

کیمبل کے نزدیک یورپ میں علم سے بیزاری کی اصل وجہ کلیسا کا رول تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے: (۱)

"Christian Church helped in lowewring further intellectual depths in Europe during Dark Age."

عیسائی کلیسا نے یورپ کی علمی سطح (ماحول) کو مزید گرانے میں مدد کی)۔

یورپ کی جاہلیت کے ماحول کا تذکرہ کرنے کے بعد کیمبل عیسائیت اور اسلام کا موازنہ بہ سلسلہ طب ان الفاظ میں کرتا ہے:

"While Christiandom was still in Dark Age, the Arbic scholars of Islam began to display remarkable activity in the department of Medicine."

(جن دنوں عیسائی دنیا تاریک دور سے گزر رہی تھی، اس وقت اسلام کے عالموں نے علم الطب میں حیرت انگیز سرگرمی کا مظاہرہ شروع کر دیا)۔

جارج سارٹن کے خیالات کیمبل کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں وہ لکھتا ہے:

Medicine was more of a magic than medicine before islam." (History of Science 1927)

(اسلام سے قبل دوا کے معنی جادو کے زیادہ تھے)۔

یورپ میں علاج و معالجہ کے لئے کلیسا کی مخالفت لیکن نبی کریم (ﷺ) کی حمایت کے پیش نظر ڈی بوئر (Deboire) نامی دانشور یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے (۴)

Muslims made sciece secular free from

(۱،۲،۳،۴) احادیث میں مذکور نباتات، ادویہ اور غذائیں۔ایک سائنسی جائزہ۔صفحہ ۲۴

Dogmos. (Islamic Thought -(1937)

(مسلمانوں نے سائنس کو فرسودہ اعتقاد سے پاک کردیا)

ڈگلس گتری (Douglas Guthre) نے رومن اور بازنطین کے علاقوں میں طبی طریقہ علاج کے خلاف عام رجحان کی بہت سی مثالیں دی ہیں اور تحریر کیا ہے کہ اگر کوئی طبی علاج کیا بھی جاتا اور اس سے فائدہ ہوتا بھی تو یہ تأثر دیا جاتا کہ کامیاب علاج دعا کا نتیجہ ہے نہ کہ دوا کا۔

امراض کو تقدیر الٰہی سمجھ لینا اور اس کے لئے کسی طبعی علاج کو غیر ضروری سمجھنا ایک ایسا طرز فکر تھا جو رومن سلطنت میں عام تھا، اور کہا جاتا ہے کہ یہی منفی طرز عمل اس کے زوال کا سبب بنا، بتایا جاتا ہے کہ ایک زبردست ملیریا کی وبا نے رومن سلطنت کی کافی آبادی کو موت سے ہمکنار کردیا، لاکھوں افراد دماغی اور جسمانی اعتبار سے مفلوج ہوگئے، سلطنت کا ڈھانچہ گرنے لگا، لیکن صورتحال پر قابو پانے کے لئے کوئی طریقہ نہ اپنایا گیا کیونکہ ایسا کرنے سے دین کی مخالفت سمجھی جاتی۔

غرضیکہ جب حضرت محمد (ﷺ) مبعوث ہوئے تو اس دور میں سارا عالم بالعموم اور عرب دنیا بالخصوص طب یا طبی علم سے بے خبر ہی نہ تھی بلکہ اس پر اعتقاد کو دین کی ضد تصور کرتی تھی، پانچویں صدی عیسوی قبل مسیح کا یونانی طبی علم تاریکیوں میں کھوچکا تھا، بقراط (Hippocratus) کا کوئی نام لیوا نہ تھا۔ ایسے دور میں نبی کریم (ﷺ) نے طب، دوا وعلاج، صحت وتندرستی، صفائی وستھرائی اور پاکی کے لئے انقلابی ہدایات عطا فرمائیں، دوا اور فسوں کاری کے رشتہ کو توڑنے کا مشورہ دیا۔ امراض کے تدارک کے لئے طبعی طرز علاج کو اپنانے کا حکم صادر فرمایا، بامعنی دعا کی اجازت دی لیکن بے معنی جھاڑ پھونک کی ممانعت فرمائی، دعا سے قبل مناسب دوا کا راستہ اپنانے کی تلقین کی، مرض کو اور مرض کے علاج دونوں کو تقدیر الٰہی سے تعبیر کیا۔

طب میں مسلمانوں کی تحقیقات وکمالات

عربوں نے اپنی فکری واجتہادی قوتوں سے کام لے کر طریقہ ہائے علاج اور

اعمال فن میں بے شمار تجربات واضافات کیے، چنانچہ اب وافد پہلا طبیب تھا، جس نے علاج بالغذاء پر زور دیا، حکیم رضی الدین نے غذائے دوائی کو دوائے خالص کے مقابلہ میں ترجیح دی، اور حکیم اوحد الزماں ابوالبرکات نے ایک خاص وبائی مرض میں قطع انامل کا علاج اختراع کیا۔

ابوالمنصور صاعد بن بشر بن عبدوس نے تمام حکمائے یونان کے قدیم طریقۂ علاج کے خلاف اکثر امراض باردہ مثلاً فالج، لقوہ، اور استرخاء کے لیے نظام طب عربی میں ادویہ باردہ اور منع غذا کا علاج رائج کیا، جو آگے چل کر بے حد کامیاب ثابت ہوا، یونانیوں کے یہاں حفظان صحت باقاعدہ ایک علم کی صورت میں موجود نہیں تھا، عرب اطباء نے حفظان صحت کے اصول مرتب کیے اور اسے ایک منظّم فن کی حیثیت سے رائج کیا، اسی طرح انہوں نے امراض چشم کے متعلق تحقیق کی، فن جراحت کو ترقی دی، شکر سازی کے معمل تیار کیے، شکر بنائی اور مرکب ادویہ کی تیاری میں شکر کے استعمال کو رواج دیا۔

مسلمان اطباء کی ایجادات کے سلسلے میں مشہور مصنف جرجی زیدان نے اپنی کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" میں ایک علاحدہ باب "ما الذی أحدثه المسلمون فی الطب" کا عنوان متعین کیا ہے جس میں تفصیل سے عربوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "عربوں نے پہلی مرتبہ علاج بالجراحت میں کاوی ادویہ کا استعمال شروع کیا، مسلولین کے ناخنوں کی کیفیت بیان کی، یرقان اور ہوائے اصفر کے علاج کا ذکر کیا، جنون کے لیے افیون کو بمقدار کثیر استعمال کرنے کی اجازت دی، نزف الدم کے لیے سر پر سرد پانی ڈالنا تجویز کیا، ضلع کتف اور نزول الماء کے آپریشن کا طریق کار بتایا، تفتیت سدد کے طریقے بیان کیے، نیز بعض ایسی فروع طب پر کتابیں لکھیں جن کا ذکر کتب متقدمین میں موجود نہیں تھا، مثلاً یوحنا بن ماسویہ نے جذام پر اور الرازی نے چیچک وخسرہ پر پہلی مرتبہ کتابیں تصنیف کیں" (۱)

عربوں نے فن طب میں جو اضافات واختراعات کیے، وہ آگے چل کر عصر حاضر کی

(۱) تاریخ التمدن الاسلامی ۳/ ۲۰۲، ۲۰۳

معلومات وتحقیقات کی اساس بنے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

منصور بن محمد نے ۱۳۹۶ء میں تشریح منصوری لکھی جو اعضائے اجسام انسانی کی تصاویر سے مزین تھی، اسی طرح علم جراحت میں ابوالقاسم الزہراوی کی کتاب بھی تشریحی تصاویر ونقوش سے آراستہ ہے، برہان الدین نے اعلان کیا کہ خون میں سکر العنب پائی جاتی ہے، اورالازی نے بیان کیا کہ معدہ میں ایک ترش رطوبت موجود ہے، ابن النفیس نے پہلی بار نظریۂ دوران خون کو بیان کیا جسے بعد میں سرویلیم ہاروے (Sir, Villiam Harvey) سے منسوب کیا گیا، مانچسٹر یونیورسٹی کے ڈاکٹر جے، بلاتھم (Dr.J.Blotham) نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔(۱)

یورپ کی ترقی کا آغاز

علم وتمدن اور نظم وانتظام میں مسلمانوں کی ان ترقیات کو دیکھ کر ان کی معاصر قوموں پر اثر پڑا جن میں خاص طور پر وہ مغربی ممالک تھے جو اندلس سے ملے ہوئے تھے، اسی کے اثر سے یورپ میں تعلیم عام ہوئی، جن کے لیے اصل مرجع مسلمانوں کی تحقیقات اور علمی انکشافات تھے، پھر قوموں کی تاریخ میں یہ اصول کارفرما ہے کہ ہر عروج کو زوال پیش آتا ہے، چنانچہ ان ترقی یافتہ مسلمان ممالک میں محنت سے کسلمندی اور غفلت شعاری کا آغاز ہوا، اوراس طرح پھر کئی صدیوں کے حالات نے شاگردوں کو ترقی کے راستہ پر آگے بڑھایا، اور کتنی تحقیق وترویج اور تمدنی فکر کا اہتمام مسلمان ترقی یافتہ ممالک سے ترقی کی راہ میں مغرب کے نوخیز ممالک کو لگادیا، چنانچہ مغربی ممالک کے لیے بعد کی صدیاں بتدریج علم وتمدن میں ترقی کی صدیاں بن گئیں، اوراسی کے ساتھ یہ صدیاں مسلمانوں کی پست ہمتی اور کم علمی کی صدیاں بنیں، اوراسی کے نتیجہ میں اس وقت مغربی ممالک کی بتدریج علمی وتمدنی ترقی اپنے بام عروج پر پہونچ گئی، اب آثار یہ بتاتے ہیں کہ یورپ کو اپنی اس پسماندگی سے نکل کر جو

---

(۱) دائرۃ المعارف الاسلامیہ، علم طب، جلد ۱۴ اص ۳۵۳

مسلمانوں کے عروج کی صدیوں میں تھی جس سے نکل کر اپنے عروج کے کمال تک پہونچنے میں تقریباً ۴صدیاں صرف ہوئیں، موجودہ صدی ان کے انتہائی عروج کی صدی کہی جاسکتی ہے، لیکن اس صدی کے اختتام پر دوسری قوموں کا ترقی کی راہ پر آنے کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، اور بیداری کا خاصا آغاز ہوگیا ہے جس سے مغرب کے عروج کو چیلنج کا سامنا ہے اور زمانہ کے دستور کے مطابق بظاہر اب ان کے زوال کا بھی زمانہ شروع ہوگیا ہے، اور اسی کے ساتھ مسلمان ممالک میں اپنی چار پانچ صدیوں کی غفلت کا احساس اور اپنے قدیم عروج کی تمنا بڑھ رہی ہے۔

مغرب کی ترقی اپنے عروج کے اختتام پر

علم وتمدن کے اس عروج میں جو مسلمانوں کو حاصل ہوا تھا اور اب مغربی ممالک کا علم وتمدن میں عروج، ان دونوں کے درمیان ایک بڑا فرق یہ ہے کہ انسانی جدوجہد کے لحاظ سے اور وسائل زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے میں علم وتجربہ سے فائدہ اٹھانے کا کام دونوں نے اپنے اپنے ترقی کے دور میں یکساں کیا۔ لیکن انسانیت کی اصل خوبیوں میں اور انسانوں کو دوسری مخلوقات پر جو برتری اللہ نے دی ہے اور جس کی بنا پر انسان کے لیے "خليفة الله فی الارض" کا اعزاز قابل قبول بنادیا ہے، اس کے سلسلہ میں مغربی تمدن نے کوئی کام انجام نہیں دیا، انسان کو صرف ایک پڑھا لکھا اور اپنی تن آسانی اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ممکنہ تدابیر سے فائدہ اٹھانے والا حیوان بنادیا، اور اس دائرہ سے باہر نکلنے کی کوئی فکر نہیں پیدا کی، چنانچہ علم وتمدن کو تو یورپ نے بہت ترقی دی، لیکن انسان کو انسانیت نوازی اور اپنے رب اور خالق کی تابعداری اور اخلاقی اطوار کو بہتر بنانے کو بالکل نظر انداز کردیا، مغربی تہذیب وتمدن کی موجودہ ترقی یافتہ سوسائٹی اپنے عروج وکمال کے باوجود ان معاملات میں بالکل نیچے چلی گئی حتی کہ ایسی مثالیں بھی ابھر کے سامنے آنے لگیں جن سے جانور بھی بچتے ہیں لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کی علمی اور تمدنی ترقی کے عہد میں ایک طبقہ برابر اس کام میں مشغول ملتا رہا کہ وہ یاددلاتا تھا کہ انسان اپنے رب کے دیے ہوئے حکموں کو سامنے رکھے اور ان کی پابندی کی کوشش

کرتا رہے، اور اس بات کا اہتمام کرنے والوں میں ایک تعداد ایسی برابر سامنے آتی رہی جس نے اپنی زندگیوں سے اس خیر وہدایت کے معیاری نمونے پیش کیے جو آج بھی مسلمانوں کے لیے اور ساری انسانیت کے لیے مشعل راہ ہیں، لیکن اس کے برعکس مغربی تمدن وعلم نے اپنی ترقی کی گذشتہ چند صدیوں میں باوجود اپنی غیر معمولی ترقیات اور تمدنی عروج کے وہ صورتحال پیدا کردی ہے کہ شخصی اخلاقیات اور دینی واخلاقی قدروں کی گراوٹ کے نتیجہ میں پورے کرہ انسانی کی مطلق تباہی کے خطرات پیدا ہو گئے ہیں، اب اس کے تدارک کے لیے بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ اس امت وسط کے افراد پوری طرح بیدار ہوں اور اپنے اسلاف کے نقش قدم کو اپناتے ہوئے ملت اسلامیہ کے مقام وسطیت کی صفات کو بحال کرنے کا فریضہ دہرائیں اور الحمدللہ اس کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

امت مسلمہ کی ذمہ داری

مغربی ممالک کے مقابلہ میں مسلمانوں کے تمدنی عروج وترقی میں جو ایک بڑی خصوصیت نمایاں تھی اور جو ان کے فکر وعمل کی اہم اساس تھی وہ امت وسط کا وہ اعلیٰ مقام اور کام تھا جو دوسری قوموں کے مقابلہ میں بالکل منفرد ہے۔

اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی اور ہے کہ ان کو اس زمین انسانی پر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو منوانا اور اس کی وحدانیت پر عقیدہ رکھتے ہوئے اس کے دیے ہوئے احکام کے مطابق انسانی زندگی کو استوار کرنا ہے، اور انسانوں کی رہبری اور پھر ان کی گواہی کے مقام کا اپنے کو مستحق بنانا ہے، چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا اصل فریضہ ہے، اس فریضہ کے تقاضہ سے انسان کی اور انسانی زندگی کی بہبودی کے اور جو تقاضے ہیں ان کو بھی پورا کرنا ہے، ان کے لیے انسانوں سے ایک مفید اور کارآمد ربط رکھنا ایک ضروری امر ہے، اس طرح انسانی زندگی کے تمام گوشے ان کے زیر عمل اور زیر اہتمام آجاتے ہیں خواہ علم کا گوشہ ہو، خواہ تمدن کا گوشہ ہو، خواہ نظم وانتظام کا گوشہ ہو، خواہ پُرامن زندگی کے تقاضے ہوں، خواہ کشمکش اور جنگ کی ضرورت ہو سب ان کے احاطہ فکر وعمل میں داخل ہیں، وہ حاکم ہوں یا محکوم، اپنوں

کو اور غیروں کو صحیح رخ دکھانے کے پابند ہیں، اسی طرح اپنے لوگوں کو اور غیروں کی بہبودی کرنا ان کا فریضہ ہے، وہ حکومت کریں تو رعیت کے لیے اس طرح بنیں جیسے خاندان کا سرپرست اپنے افراد خاندان کے لیے ہوتا ہے کہ فائدہ کم اٹھاتا ہے اور شفقت اور راحت رسانی کی فکر زیادہ کرتا ہے اور تربیت اور اخلاقی بہتری کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کے طریقہ اختیار کرتا ہے، اور محکوم ہوں تو اپنے رفقاء اور انسانی برادری کے دوسرے افراد کے لیے ایک خیر طلب بھائی کی حیثیت سے معاملہ کرتا ہے کہ راحت وسہولت بھی سب کو حاصل ہو اور اخلاق وکردار اور خدائے واحد کی بندگی کے طور وطریق کی تلقین ونصیحت کا بھی اہتمام کرتا ہے اور چونکہ یہ سارے پہلو دین ودنیا دونوں کو سمیٹے ہوئے ہیں اس لیے اس کو جو دین دیا گیا ہے اور اس کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) نے جو ہدایات دی ہیں وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہیں حتیٰ کہ وہ پہلو جو خالص دنیاداری کے معلوم ہوتے ہیں، ان کے سلسلہ میں بھی اسلام میں ہدایت موجود ہے، اسی کو محسوس کرتے ہوئے ایک یہودی نے ایک مسلمان پر اسلام کے عہد اول میں یہ طنز کیا کہ تمہارے نبی ایسے ہیں کہ پیشاب پاخانے کی بھی باتیں کرتے ہیں، مسلمان نے جواب دیا ہاں ہمارے نبی پیشاب پاخانے کے لیے جو اچھا ڈھنگ اور طریقہ ہے اس کو بھی بتاتے ہیں، چنانچہ انہوں نے قضائے حاجت میں جو اچھا اور سلیقہ مند طریقہ ہے، اس کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ ہمارے نبی (ﷺ) نے بتایا ہے۔

اسلام فلاح انسانیت کا ضامن

اس طرح اسلام ایسا جامع مذہب بنا کر دیا گیا جو انسان کی ضرورت اور اس کی زندگی کے تمام تقاضوں کو ان کے اچھے ڈھنگ کے مطابق اپنی ہدایات سے نوازتا اور ان طریقوں کی رہنمائی کرتا ہے، جن میں انسان کی جسمانی راحت اور سلامتی بھی ہے اور روحانی خوبی اور فائدہ بھی ہے، اور یہ بات امت اسلامیہ کے امت وسط ہونے کے معیار کے مطابق ہے۔

امت اسلامیہ کو اس کی ان ہی صفات کی بناء پر جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر فرمائیں، اور ان کے اختیار کرنے پر اس کو سب امتوں سے فائق اور ممتاز امت قرار دیا،

اور ''خیرامت'' کے لفظ سے موصوف کیا، اس امت کی یہ وہ صفت ہے، جواس کے منصب اوراس کی سیرت دونوں پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہے، اس کے منصب کے لحاظ سے جواس کی خصوصیات بنتی ہیں، ان کا ذکر گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے لیکن اس کی جو خصوصیت سیرت وکردار سے تعلق رکھتی ہے، وہ صفت وہ ہے جواس کے منصب والی خصوصیات کی اصل طاقت ہے، اور وہی ان دیگر قوموں سے بھی اس کو فائق بناتی ہے، جو الگ الگ دوسروں میں وقتاً فوقتاً پائی گئی ہیں، مثلاً علم وفکر میں تفوق، تمدن اور نظام حکومت کا کمال، تجربہ وتحقیق اور وسائل زندگی کے حصول میں بہتر کامیابی لیکن دیگر قومیں سوائے آسمانی مذہب رکھنے والی قوموں کے، ایمان باللہ کی حقیقی خصوصیت سے خالی رہیں، جس کی وجہ سے وہ اپنی انسانی سیرت اور اخلاق میں باوجود تمدنی وعلمی ترقی کے حیوانات سے بہتر نہیں، جس کا ثبوت ان کی اجتماعی وانفرادی زندگیوں کے سفاکی اور اباحیت کے وہ واقعات ہیں جن میں بعض وقت حیوانات سے بھی نیچے گر جاتے ہیں چنانچہ ان میں حیوانات کے طرز زندگی سے بھی بدتر شکلیں پائی گئی ہیں، اس میں وہ آسمانی مذاہب کی قومیں بھی صحیح راستے سے ہٹ گئی ہیں، وہ بھی ان خرابیوں میں مبتلا نظر آتی ہیں اور امت مسلمہ کے جن افراد نے صحیح راہ سے روگردانی کی، ان کی زندگیوں میں بھی یہ خرابیاں ملتی ہیں لیکن یہ جستہ جستہ انفرادی طور پر ملتا ہے، مجموعی طور پر امت مسلمہ اس میں فائق وممتاز ثابت ہوئی۔

امت اسلامیہ امتیازی اور رہبرانہ صفات کی امت

آسمانی مذاہب کا اصل راستہ ایمان باللہ کا جچا تلا معین راستہ ہے، جس میں خدائے واحد پر دل سے یقین اور صدق دل سے اس کی بندگی اور اس کے بھیجے ہوئے رسول کی رہنمائی کی پابندی، یہودیت کے بعد عیسائیت اور عیسائیت کے بعد اسلام، خدائے واحد کی بندگی کے راستے پر چلی، نئے نبی کے آنے کے بعد سابق نبی کی امت کی طرف سے اس کی تابعداری سے گریز، خدائے واحد کی اطاعت سے گریز کی حیثیت رکھتا ہے، آخری نبی (ﷺ) کے مبعوث ہونے کی اطلاع سابقہ نبیوں نے دی تھی، چنانچہ حضرت محمد (ﷺ) خاتم النبیین کی

حیثیت سے بھیجے گئے، ان کے بعد کسی نبی کو نہیں آنا ہے چنانچہ کسی بھی ملت کے فرد کو نبی کریم (ﷺ) کے آنے کے بعد ان سے گریز کی گنجائش نہیں، اور اس کے بغیر ایمان معتبر نہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کی امت کو ''خیر امت'' قرار دیتے ہوئے اس کا عمل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور خصوصیت ایمان باللہ بتائی ہے اور تاریخ اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ چودہ سو سال اس امت کو شروع ہوتے گزرے ہیں، اس دوران اس کے عمل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نتیجہ میں خدائے واحد کا پیغام دنیا کے ہر سرے میں پہنچا، اور جہاں جہاں اور جن جن لوگوں نے اس کو سننے کی اور جاننے کی طرف توجہ کی، وہاں وہاں یہ قبول بھی کیا گیا اور جہاں اس کی پرواہ نہیں کی گئی وہاں اس کو نظر انداز کیا گیا، لیکن حجت پوری ہوگئی، اقصائے مشرق سے لے کر اقصائے مغرب، اقصائے شمال سے لے کر اقصائے جنوب تک کون سی جگہ ہے جہاں اس کے پیغام کے جاننے اور عمل کرنے والے کچھ نہ کچھ پائے نہ جاتے ہوں اور جن کی زندگی اور جن کا وجود اس بات کی دعوت نہ دیتا ہو کہ ہم کو دیکھو اور اس بات کو سمجھو کہ ہم کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں اور وہ تمہارے لیے بھی ضروری ہیں۔

امت اسلامیہ کا عالمی کام اور ابدی پیغام

اور اس پر بطور مزید یہ بات بھی ہے کہ جگہ جگہ اس دین کی اور خدا کی صحیح بندگی کی راہ کی تلقین کرنے والے، پورے اخلاص اور محنت کے ساتھ اس پیغام کو پہنچانے اور سمجھانے پر محنت کرتے رہے، اور بعض بعض کی محنتوں کا ثمرہ پورے کے پورے علاقے کی ہدایت پر ظاہر ہوا، اس کی بے شمار مثالیں ہیں اور تاریخ اس کی گواہ ہے، ایران، افغانستان، سندھ و ہند اور ممالک مشرق اقصیٰ بنگال تا جاپان، چین، کوریا، منگولیا، سائبیریا، فلپائن، آسٹریلیا، سب جگہوں پر یہ دعوت اور اس کے نمونے پہنچے، پہنچانے والوں کی محنتوں کا تذکرہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیسی ہمت، صبر، کسر نفسی اور مخلوق خدا کو خدا کی بندگی میں لانے کی تڑپ کے حالات ملتے ہیں، جن میں اس فکر و محنت کے کرنے والوں کی ایمانی زندگی اور ایمانی جذبہ بھی محیر العقول حالات کے نمونے پیش کرتا ہے، جو ان کے خیر امت ہونے کی دلیل بنتا ہے،

مغربی ممالک میں چلے جایئے تو مسلمانوں کے گروہ اور کار پرواز افریقہ ہوتے ہوئے براہ اسپین فرانس تک پہونچے اور دوسری طرف سے براہ قسطنطنیہ، یورپ کے مشرقی ممالک میں گزرتے ہوئے سوئزرلینڈ اور جرمنی تک پہونچے کہ جن کا پہنچنا پیغام خداوندی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی تھا اور آج یورپ کے ہر خطہ میں اسلامی دعوت و کردار کے نمونے ان مسلمانوں کی شکل میں ملتے ہیں جو دین حق کے داعی کی حیثیت سے وہاں موجود ہیں، افریقہ وامریکہ میں اس وقت کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اس ''خیرامت'' کے افراد، کسی نہ کسی حد تک پائے نہ جاتے ہوں، جو خدا کی بندگی کی صحیح راہ کو ظاہر کرتے ہیں۔

امت اسلامیہ کے کام کی جامعیت اور آفاقیت

یہ آسمانی زندگی خدا کی صحیح بندگی اور اس کے احکام کی صحیح پابندی کی کوشش کے ساتھ زندگی کے تمام پہلوؤں میں بھلائی اور نیکی اور انسانیت کی ساری قدروں پر عمل اور ایسے کاموں پر مشتمل ہے، جن میں اس دنیا کی بھلائی اور مرنے کے بعد کی دنیا کی بھلائی پائی جاتی ہے، اور اسی سے یہ ''خیرامت'' امت وسط بننے کی خصوصیت حاصل کرتی ہے، جس کی بناء پر وہ سارے انسانوں کے اوپر قیامت کے روز گواہ بنے گی۔

مغربی فکر وثقافت اور اسلام

اصول وطریقۂ زندگی کے مآخذ

موجودہ دور میں مسلمان دو مختلف مرکزوں سے فکری وثقافتی علوم حاصل کر رہے ہیں۔
ایک مرکز اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب قرآن مجید، اس کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) کے ارشادات اور گذشتہ علماء کی تحقیقات وآراء کا ہے۔
اور دوسرا مرکز مغربی مفکرین ومستشرقین کی تحقیقات کا ہے۔

اسلامی مآخذ اور ان کی جامعیت

مذکورہ مرکزوں میں سے مرکز اول مسلمانوں کا ایک عظیم مرکز فکر وثقافت ہے، جو بیش قیمت بھی ہے اور بھرپور بھی، جو غیروں کے علوم پر اس خصوصیت کی وجہ سے فوقیت رکھتا ہے کہ وہ زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے، یہ مرکز اپنے اندر خالص اسلامیات رکھتا ہے کیونکہ اس کی تشکیل نہایت اعلیٰ طرز پر اور بہترین طریقہ پر اس طرح کی گئی ہے کہ ان کا سرچشمہ قرآن وحدیث رہے، ان دونوں سرچشموں نے اپنی جامع اور متنوع تعلیمات کے ذریعہ پوری انسانی زندگی کا احاطہ کرلیا ہے، قرآن کریم کی مختلف سورتوں مثلاً اسراء، لقمان، نور، حجرات وغیرہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ پوری وضاحت کے ساتھ انسانی زندگی کے اخلاقی گوشوں اور انفرادی واجتماعی سلوک وکردار نیز انسانی معاشرہ کے آداب کی تشریح ملتی ہے، اور مسلمانوں کو کائنات کی پیدائش اور اس میں بکھرے ہوئے قدرت کے کرشموں پر غور وتدبر کی دعوت دی گئی ہے۔ احادیث میں بہت سے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی

ہے، اورانسان کے لیے خدا کی پیدا کی ہوئی اشیاء کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

صحیح احادیث کی کتابوں کے مختلف ابواب میں عام انسانی زندگی کے اچھے اور برے کردار کے متعلق خاصی معلومات ملتی ہیں، رسول اللہ (ﷺ) نے اپنے ہاتھ سے محنت کر کے طلب معاش کی ترغیب دی، کھجور کی قلم لگانے کے سلسلہ میں آپ (ﷺ) نے فرمایا "انه من أمر دنیاکم" (یہ تمہاری دنیا سے متعلق معاملات ہیں)۔

آپ (ﷺ) نے علم حاصل کرنے کا حکم دیا، زندگی کے مختلف شعبوں کے آداب بتائے، آپ (ﷺ) کی ہدایات وتعلیمات زندگی کے مختلف گوشوں پر اس طرح محیط تھیں کہ ایک غیر مسلم تعجب سے کہنے لگا:

> "یہ رسول تو پاخانہ پیشاب کے طریقوں، انسانوں کے باہمی تعلقات اور پڑوسی کے پڑوسی سے تعلقات وغیرہ جیسی معمولی چیزوں کی بھی تعلیم دیتے ہیں"۔

ان سب تعلیمات وہدایات کے نتیجہ میں انسانی علوم ومعارف کا ایک عظیم الشان سرمایہ وجود میں آ گیا، بعد کے علماء نے اس قیمتی سرمایہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا، اوراسے اور بھی مالامال کیا، قرآن وحدیث کے سرچشموں سے تیار ہونے والا یہ سرمایہ گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں کی بیش قیمت دولت تھی اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی تھی۔

دوخوبیوں کا حامل سرمایۂ فکر واخلاق

یہ سرمایہ دوخوبیوں کا جامع تھا، ایک یہ کہ وہ حیات انسانی کے مختلف گوشوں پر حاوی تھا، دوسرے اس پر اسلامیت کی چھاپ تھی، اسی لیے ہمیں نئے مسلمانوں کے تصورات اوران کی سیرت اور ثقافت میں قدیم اسلاف بلکہ انبیاء سابقین کے پیروکاروں کے تصورات سے مشابہت ملتی ہے اس کی وجہ یہ ہوئی کہ دونوں طبقوں کے مابین زمانہ کے فرق اور دوری کے باوجود بڑا قرب رہا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر گذشتہ امتوں کے واقعات ذکر فرمائے،

اوران کی زندگی کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو بتایا، اس میں مسلمانوں کے لیے یہ تعلیم تھی کہ وہ اچھے پہلوؤں کو اختیار کریں اور برے پہلوؤں سے گریز کریں، قوم عاد کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ وہ عالی شان عمارتیں تعمیر کرتے تھے، اور اپنی قوت وسطوت کی دھاک دوسروں پر بٹھائے رکھتے تھے، قوم ثمود کے تذکرہ میں فرمایا گیا کہ پہاڑوں سے نادر نمونے تراشتے تھے، غرور وتکبر ان کے سر چڑھا ہوا تھا، زمین میں شر وفساد مچا رکھا تھا، اسی طرح دوسری اقوام کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

قوم سبا کے تعمیر کردہ باندھ کا بھی تذکرہ قرآن مجید کرتا ہے جس کے دونوں جانب دو باغ تھے، خوبصورت شہر تھا اور اللہ تعالیٰ کی ان پر عنایت تھی، لیکن جب ان کی سیرت بگڑ گئی تو ان کی شان وشوکت بھی جاتی رہی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خیر وشر کی مثالیں ذکر فرمائیں اور خیر کی ترغیب دی، اور بعد والوں کو اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کا حکم دیا، متقدمین اور متاخرین دونوں کو ایک امت قرار دیا، فرمایا:

"إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ "(انبیاء:۹۲)

(یہ تمہاری جماعت ہے یہ ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں میری ہی عبادت کرو)۔

دوسری جگہ فرمایا:

" قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ" (آل عمران:۹۵)

(کہہ دو کہ اللہ نے سچ فرمادیا پس دین ابراہیم کی پیروی کرو جو سب سے بے تعلق ہو کر ایک (خدا) کے ہو گئے تھے اور مشرکوں میں نہیں تھے)۔

مسلمانوں کے علمی سرمایہ سے مغرب کی خوشہ چینی

مسلمانوں نے اپنے اس سرمایہ سے برابر فائدہ اٹھایا اور اس میں مزید وسعت دی،

اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا، اور یہ سب تاریخ کے اس دور میں انجام دیا جس میں یورپ تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا، یہ ان کا Dark Age تھا، لیکن اسپین میں وہ مسلمانوں کے علوم ومعارف سے آشنا ہوئے تو ان کی آنکھیں کھلیں، وہاں انہوں نے مسلمانوں کا عظیم الشان علمی سرمایہ دیکھا اور مسلمان علماء کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور اندلس کے تعلیمی مراکز سے وابستہ ہوئے اور پوری محنت اور جستجو کے ساتھ استفادہ کیا، اور ان کی بہت سی تحقیقات جو مختلف النوع موضوعات اخلاقات، تہذیب وثقافت سماجی علوم، تاریخ وجغرافیہ سے تعلق رکھتی تھیں اپنی کتابوں میں منتقل کیں، فن جہازرانی میں ابن ماجد کا شہرتھا، البیرونی مختلف ثقافتی وسماجی موضوعات پر قافلہ سالار کی حیثیت رکھتا تھا، ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں انسانی، ادبی اور ثقافتی علوم پر انمٹ نقوش ثبت کئے، یہ سب اس بات کی واضح اور روشن دلیل تھے کہ انسانی علوم میں دوسروں پر مسلمانوں کو ہر حیثیت سے فوقیت حاصل تھی، اور دنیا کے علمی سفر میں مسلمانوں کے کارناموں سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

مسلمانوں کا علمی وتمدنی زوال

لیکن حالات نے دوسری کروٹ لی اور مسلمانوں نے اپنی تحقیق وجستجو کا سر روک دیا، اسلاف کے کارناموں پر قناعت کرلی، اور اپنے سرمایہ میں مزید اضافہ نہیں کیا۔

دوسری جانب مغربی اقوام نے علم کے میدان میں اپنے قدم آگے بڑھائے اور تحقیق وتلاش کے میدان میں سرگرم ہوگئیں، اور پورے عزم وہمت سے کام لیا رفتہ رفتہ ترقی نے ان کے قدم چومے اور نئے نئے علوم کا انکشاف ہوا، علمی ومادی سرمایہ اور قوت اور سامان اور سامان زندگی کی فراہمی میں انہیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔

مسلمانوں کے علمی سرمایہ پر یورپ کی اثر اندازی

مغربی اقوام جو عیسائیت کی ماننے والی تھیں ان کے مذہبی اعتقادات، مخصوص طرز فکر اور اسلام دشمن تصورات نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ مسلمانوں سے حاصل کئے ہوئے ان علوم پر وہ عیسائیت کی چھاپ لگالیں پھر یورپ کے حالات نے قدیم مذہبی اعتقادات کے خلاف

زبردست بغاوتیں برپا کیں، جن کے نتیجہ میں ایک ہمہ گیر تبدیلی وہاں نئے تصورات ابھرے اور یورپ جس پر مسلمانوں کا گرانبار احسان تھا مسلمانوں کا دشمن ہوگیا۔

مغربی زندگی کی اس خاص صفت اور اس کی اسلام دشمن نفسیات نے اس کے طرز زندگی اور علوم انسانی کے نہج کو مسلمانوں کے نہج سے بالکل مختلف بندیا، یورپ کی اباحیت پرستی اور الحادی زندگی کا مسلمانوں کی زندگی سے کوئی جوڑ نہیں تھا۔

یورپ کی سائنسی ترقی اور اس کے اثرات

یورپ کے سائنس دانوں نے اپنا سفر تحقیق وجستجو جاری رکھا انسانی اور کائناتی علوم میں نئے نئے آفاق دریافت کئے لیکن ان علوم ومعارف کی روح انہی حالات کی پیداوار تھی، جس سے یورپ مدت سے گزر رہا تھا، یہ حالات عیسائیت، الحاد، اباحیت قومی ونسلی غرور اور استعماریت کے خمیر سے تیار ہوئے تھے۔

یورپ کے مفکرین اور فلاسفہ نے اپنے علوم میں ایسے انوکھے نظریات اپنائے، جو مسلمانوں کے دین ومذہب سے متعارض تھے ان نظریات نے ان کے اسلوبِ فکر اور ان کے مطمح زندگی پر گہرا اثر ڈالا، اور ان سے انسانی اخلاق کا لبادہ اتار کر جانوروں کی صفات اور بہیمانہ اخلاق تک انہیں پہونچادیا۔

مغرب کے ملحدانہ اور نفس پرستانہ افکار

یورپ کے مفکرین میں ''ڈارون'' (Charles R. Darwin) اہم حیثیت رکھتا ہے، جس نے انسان کو بندر کی صف میں لا کھڑا کیا، اور دونوں کو ایک ہی خاندان کے افراد قرار دیا، اس طرح اس کی نظر میں نوع انسانی نوع بہیمی سے جاملی۔

پھر ''مارکس'' (Karl Marx) نے اقتصادیات کو حل کرنے کا بیڑہ اٹھایا، اس کا فلسفہ ''ہیگل'' کے فلسفہ پر مبنی تھا ''مارکس'' نے نہ صرف اقتصادیات بلکہ سیاسیات میں بھی اپنی خالص مادی اور ملحدانہ فکر عام کرنے پر اپنی بہترین کوششیں صرف کیں، اور اسے بڑی حد تک کامیابی بھی ملی، یورپ کے ان علاقوں میں جو اس انقلابی نظریہ سے متاثر ہوئے، انسانی علوم

مارکسی نظریہ سے متاثر ہوئے، اور یورپی عقلیت پرستی نے اس رنگ کو قبول کیا۔

اسی پر بس نہ ہوا بلکہ یکے بعد دیگرے متعدد نظریات اور افکار سامنے آتے رہے جنہوں نے لوگوں کے دل ودماغ کو متاثر کیا، سیرت وکردار میں ''وجودیت'' اور ڈارون کی ''ارتقائیت'' کے نظریہ اور سیاست میں میکاولی نظریہ سامنے آیا جنہوں نے عوام وخواص کے رجحانات اور طبیعتوں پر اثر ڈالا، اور انسانی زندگی کے تمام گوشے اس سے متاثر ہوئے، روسو (Rousseau) اور والٹیر (Voltaire) نے بے قید آزادی کی راہ بنائی، پھر فرائڈ کے نظریہ جنسیت نے تو بالکل اخلاقی رجحان ہی بدل دیا۔

نئی تہذیب وتمدن میں ملحدانہ ونفس پرستانہ افکار کا رنگ

ان افکار نے انسانی علوم کو اس طرح متاثر کیا کہ اس سے ایسے مفسدانہ نتائج برآمد ہوئے جو نئی تہذیبوں کے لیے باعث فساد ثابت ہوئے، اور انہی کی چھاپ لیے ہوئے زندگی کا نیا فلسفہ وجود میں آیا یہ فلسفہ زندگی، قدیم فلسفۂ زندگی سے مختلف تھا اور اسی طرح مسلمانوں کے عقلی، علمی وثقافتی اور دینی سرمایہ سے بھی مختلف تھا، وہ ان اخلاقی قدروں سے عاری تھا، جنہیں قرآن مجید اور حدیث نبوی نے اسلامی زندگی میں مقرر کر رکھا ہے، جس کی بنیاد، توحید، اللہ ورسول کی اطاعت اور انسانی آداب کی محبت پر تھی جو حرکت ونمو، عمل ونشاط اور وحدت سے آراستہ تھی۔

اسلامی فکر واقدار سے مغربی افکار کا تضاد

اسلامی معاشرے، اسلام کی تعلیمات کے سایہ میں تشکیل پاتے ہیں، وہاں انسانیت ہے، قدریں ہیں اور حیوانی آزادی نہیں ہے، اسلام نے زندگی کے تمام گوشوں پر اپنی نگرانی رکھی ہے، وہ پورے انسانی علوم کو الٰہی رنگ میں رنگتا ہے۔ "ومن احسن من اللّٰہ صبغۃً" (اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہوسکتا ہے)

مغربی علوم انسانی، اسلامی علوم انسانی سے بے حد مختلف ہیں، مغرب میں سیاست ادب اور سماجی علوم پر، روسو، مارکس، والیٹر، فرائڈ اور سارتر وغیرہ کے افکار چھائے ہوئے

ہیں۔علم اقتصادیات پر یہودی فکر، مادی ملحدانہ فکراور مارکسی اشتراکی فکر کا غلبہ ہے، ملک ووطن سے منسلک علوم میں سامراجی اور نسلی قومیت کارفرما ہے، جن میں امپریل ازم، کمیونزم، اور نسلی ووطنی عصبیت سے معمور خیالات ہیں، یہی حال دوسرے انسانی علوم کا ہے، ان سب پر انتہا پسندانہ یورپی فکر کی چھاپ ہے، یہ صحیح ہے کہ مغربی معاشرہ پر ایک دور مسیحی رہبانیت کا بھی گزر چکا ہے جس میں ترک دنیا کو خاص اہمیت حاصل تھی، لیکن پھر دوسرا دو مذہب کے خلاف بغاوت اور یورپ کے ظالمانہ امپریل ازم اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت کا گزرا ہے، ان دونوں کا ردِّعمل بھی سامنے آیا جس نے مغربی عقلیت پر اپنے نقوش ثبت کیے۔

اس کے برعکس مسلمان اور غیر مغربی قومیں ان حالات سے نہیں گزریں جن کا یورپ کو اپنی ماضی قریب کی صدیوں میں سامنا کرنا پڑا، اس لیے ان قوموں کو اس بات کی ہرگز ضرورت نہیں تھی کہ وہ انسانی علوم کے میدان میں علماء یورپ کی عقلیت کو نمونہ بنائیں۔

اسلامیت کا توازن اور مسلمانوں کے تجربے

خدائے عزوجل کا فضل ہے کہ اس نے مسلمانوں کو یورپ کی انتہا پسندانہ مساوات سے محفوظ رکھ کر اسلامی مساوات کا نظام عطا فرمایا، خودغرضانہ جمہوریت کے بجائے انسانی اخوت اور انسانی جذبۂ ہمدردی عطا کیا، بہیمانہ آزادی کے بجائے ایسی آزادی سے سرفراز کیا جس میں اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے احکامات کی بجا آوری تھی، پھر مزید یہ کہ مسلمان ایسے تجربوں سے نہیں گزرے جن سے یورپ اپنی غلط کاریوں کے باعث اپنی طویل تاریخ میں گزرا۔

اس صورت حال میں مسلمانوں کے لیے کیونکر یہ بات معقول ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے کو یورپ کے حالات میں رکھ کر دیکھیں اور ان کے امراض کو اپنے امراض تصور کریں اور پھر ان کے اختیار کردہ فاسد طریقۂ علاج کو اپنے لیے موزوں سمجھیں۔

مسلمانوں کا لائحہ عمل کیا ہو؟

علوم انسانی کے میدان میں مسلمانوں کے لیے مناسب یہ ہے کہ اولاً اس سرمایہ پر

اپنی توجہ مبذول کریں جو رسول اللہ (ﷺ) کی سیرت اور ان کی تعلیمات، صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ نیز اس راہ پر گامزن علماء، ادباء، محققین اور مفکرین اور اصحاب سیاست وسماجیات سے حاصل ہوا ہے، پھر یورپ کے قدیم وجدید علوم میں سے زندگی کے تقاضہ کے مطابق وہ چیزیں لیں جو ان کے ملی مزاج سے ہم آہنگ اور ان کے لیے مفید ہوں، یہی طریقہ مسلمانوں کے عظیم الشان تاریخی مقام ومرتبہ اور انسانی شرف وکرامت کے شایان شان ہے۔

مسلمانوں کی یورپ کے تمدن سے مرعوبیت

لیکن ان آخری صدیوں میں مشرقی اقوام اور مسلم امت سخت پسماندگی کے دور سے گزری، وہ وسائل زندگی سے محروم، کمزوری اور ذلت کا شکار تھی، جب کہ مغربی اقوام فاتحانہ شان وعظمت کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے استعماری مقاصد کے لیے ملکوں کو فتح کیا وہاں کے خزانوں اور مادی وسائل پر قبضہ کیا، اور دوسری اقوام کو اپنی تقلید کرنے پر مجبور کیا۔

ان سب حالات نے مسلم اقوام کو بھی مرعوب کیا وہ سمجھنے لگیں کہ یقیناً مغرب ہی کی کاوشوں کے نتیجہ میں زندگی کے علوم ومعارف وجود میں آئے ہیں، اور انہی سے دوری نے مشرقی اقوام کو پسماندگی، سستی اور کاہلی کا شکار بنایا ہے، اقوام مسلم نے ساتھ یہ بھی گمان کرلیا کہ یورپ اس بات کا مستحق ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں اس کی پیروی کی جائے، اور ہر صنف علم میں اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جائے، اور یورپ کی علمی ترقیاں، لادینی نظام اور اباحیت پسندانہ سیرت وکردار میں اس کی تقلید کی جائے، یہ سوچ کر بعض مشرقی اقوام نے زندگی کے تمام گوشوں اور اس کی تمام شکلوں میں یورپ کی اتباع کی اور یورپ ہی کی مقلد قوموں، چینی اور جاپانی قوم کو بھی معیار تقلید سمجھا، چین اور جاپان کے پاس خود کوئی آسمانی نظام زندگی نہیں تھا، اس لیے مغرب کی تقلید ہی کو انہوں نے اپنے لیے معیار بنایا۔

مرعوبیت کا علاج

لیکن امت مسلمہ کا معاملہ دوسرا تھا، وہ اسلام کا دائمی وآسمانی دستور حیات رکھتی تھی،

ان کے لیے اس بات کا کوئی جواز نہیں تھا کہ ادنیٰ پر فریفتہ ہو کر اعلیٰ کو چھوڑ دیں۔

"أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِيْ هُوَ أَدْنَى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ"۔(البقرہ:٦١)

(بھلا بہتر چیز چھوڑ کر اس کے عوض ناقص چیز کیوں چاہتے ہو؟)

اور اپنی اقدار و تعلیمات سے منھ پھیریں، البتہ دنیاوی امور میں رسول کریم (ﷺ) نے یہ اجازت دے رکھی تھی "انه من أمر دنیاکم" یعنی تمہارے دنیاوی تجربے اور انکشافات جن کا اخلاقی، ثقافتی اور دینی احکام سے ٹکراؤ نہیں ہے ان سے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو، اس لیے مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ یورپ کی تقلید ان انسانی علوم میں کرنے سے پوری طرح گریز کریں جو انہیں نقصان پہونچانے والے اور ان کے اخلاق کو بگاڑنے والے ہوں، اسلام کا نظامِ اخلاق اور دستور زندگی، اسلام کی بلند آسمانی تعلیمات پر مبنی ہے، بے راہ رو انسانی افکار پر نہیں، اسلام کی نظر میں، انسان خدا کا بندہ ہے، اور اس کی تخلیق بے مقصد نہیں ہوئی ہے، اس پر زندگی کے کچھ اصول و ضوابط عائد کیے گئے ہیں جو اس کی پوری زندگی پر محیط ہیں، چونکہ اللہ انسان کا خالق ہے اس لیے وہ انسان کی ضروریات، اس کے تقاضوں اور اس کے طبعی میلانات کو اچھی طرح جانتا ہے، اگر خدا تعالیٰ، انسان کے لیے کوئی نظام زندگی تجویز کرتا ہے، تو بلا خوف تردید یہ بات کہی جائے گی کہ وہی نظام زندگی انسان کی طبیعت وفطرت سے ہم آہنگ، اس کے تقاضوں کو پورا کرنے والا اور اس کی ضروریات کا کفیل ہے لہٰذا کسی فرد مسلم کے لیے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت سے استثناء نہیں بلکہ اسی میں اس کی فلاح اور نجات ہے۔

لیکن اگر وہ یورپ کی تقلید کو اختیار کرتا ہے تو اسے راستہ میں ایسی گھاٹیاں اور سراب پیش آئیں گے جو آسمانی نظام زندگی کی اتباع سے روک دیں گے۔

اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عمل کے میدان میں صرف دو ہی صورتیں ہیں، یا تو ملحدانہ، لادینی نظام زندگی کی بالکل اندھی پیروی کی جائے، اور موجودہ خدا بیزار تہذیب کا حاشیہ بردار بن کر وقت گزارا جائے، یا اپنے لیے اس راہ کا انتخاب کیا جائے، جسے قرآن وحدیث کی تعلیمات نے ہموار کیا ہے اور دنیا کا قائد و رہنما بن کر زندگی بسر کی جائے۔

یورپ کی اندھی تقلید

لیکن قابل افسوس امر یہ ہے کہ یہ مسلم انسان جو مسند قیادت پر ایک عرصہ رہ کر سو گیا تھا، پھر صدیوں کی گہری نیند کے بعد ایسے وقت میں بیدار ہونا شروع ہوا کہ اس کی بیداری کے وقت یورپ ترقی و عمل کی راہوں پر بہت آگے بڑھ گیا ہے، چنانچہ وہ جدید یورپ کی تہذیب کی چمک دمک، کائنات کے علوم میں اس کی حیرت انگیز ترقی اور انسانی علوم سے حد درجہ اشتغال کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا، اس نے دیکھا کہ یورپ نے قوت کے سر چشموں اور مادی خزانوں کو فتح کر لیا ہے، مشینی علوم میں بیش قیمت پیش رفت کی ہے، اس کی سیاسی سطوت کا آفتاب نصف النہار پر ہے، اس کے نظریہ اور فکر کی دھوم مچی ہے، اس کو دیکھ کر وہ احساس کہتری کا شکار ہو گیا اور اسی میں اپنی عافیت تصور کرنے لگا کہ یورپ کی تقلید کا جوا اپنی گردن میں ڈال لے، اور تعلیم و تربیت میں اس کا نظام اپنا لے، اس نے اس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ اس پر غور کرے کہ کون سی چیزیں ہمارے موافق اور ہمارے دین و مذہب سے میل کھاتی ہیں، اور کون سی نہیں۔ اس نے یورپ کا مکمل نظام تعلیم و تربیت اور اس کے انسانی علوم کو بعینہ اپنی درسگاہوں میں اختیار کر لیا، اگر ان کے طے کردہ افکار کے ذریعہ کوئی دوسرے افکار تیار بھی کیے تو اسی نہج پر۔

مسلمانوں کی درس گاہیں یورپ سے متاثر

آج بھی عالم اسلامی کی درس گاہیں مغربی افکار و تاثرات، مغربی علماء کے انکشافات اور ان کی تحقیقات کی صرف خوشہ چیں ہیں، ان درس گاہوں کے ارباب حل و عقد و منتظمین کو مغربی علوم و ثقافت کی مکمل خوبی پر یقین ہے اور انہیں مغربی تہذیب و ثقافت کے جو مضر پہلو ہیں ان کا احساس نہیں اور نہ ہی وہ اپنی نسلوں کو مغربی تہذیب و ثقافت کے سانچہ میں ڈھلنے سے بچانے کی ضرورت سمجھتے ہیں۔

سماج اور تعلیمی نظام پر یورپ کے اثرات کا جائزہ

اگر ہم اسلامی مشرقِ اقصیٰ سے لے کر اسلامی مغرب اقصیٰ تک کا ایک جائزہ لیں

تو یہ افسوس ناک امر سامنے آئے گا کہ وہاں کی درس گاہوں، تربیتی مراکز اور نظام ونصاب تعلیم سب کے سب مغربی نظام کا چربہ ہیں، جس میں مغرب کی وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو مشرق اور اسلام دونوں کی ضد ہیں۔

علم معاشیات، وسیاسیات، تاریخ وجغرافیہ، فن ادب ونقد، علم النفس، تعلیم وتربیت اور ثقافت وتمدن، ان تمام علوم میں مغربی اثرات اور انداز فکر پوری طرح نمایاں ہے، اور ان علوم پر مغرب کی جاہلی عقلیت اور طرز زندگی کا بڑا گہرا اثر مرتب ہوا ہے، یہاں بھی وہی جاہلیت کارفرما ہے جو ماقبل بعثت نبوی کفر کے ماحول میں موجود تھی، فرق صرف اتنا ہے کہ مغرب کی موجودہ جاہلیت تعلیم یافتہ ہے اور قبل بعثت نبوی کی جاہلیت علم سے بے گانہ تھی، اور یہ بات یونیورسٹیوں اور دیگر مغربی طرز کی درسگاہوں میں رائج علوم ومعارف انسانی کے نصاب سے پوری طرح عیاں ہے۔

معاشیات

انسانی علوم میں سے معاشیات ایسا علم ہے جس پر سب سے زیادہ یہودی سودی فکر یا ملحدانہ مارکسی فکر کا اثر مرتب ہوا جس نے معاشی نظام کو عوامی خدمت کے بجائے عوام کی رگوں سے خون چوس لینے والی جونک بنا دیا۔

اسلامی اصولوں سے آراستہ غیر سودی بنک کاری نظام جو چند برسوں قبل ایک خواب تصور کیا جاتا تھا بلکہ اپنے درویشوں اور پسماندہ ذہن انسانوں کا خیالی نظام تصور کیا جاتا تھا آج ایک خوش آئند حقیقت بن کر ابھر رہا ہے، اور دنیا کے مختلف علاقوں اور ملکوں میں جن میں مسلم وغیر مسلم ممالک شامل ہیں، غیر سودی بینکوں کے قیام کا عمل شروع ہو گیا ہے، اور اس کے امید افزا نتائج سامنے آرہے ہیں۔

کارل مارکس کا نظریہ تھا کہ ''مذہب'' قوموں کے لیے افیون ہے، اور ضروریاتِ زندگی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے، لیکن غیر سودی اداروں اور بینکوں کی کامیابی نے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

سیاسیات

اب ذرا جمہوریت پر ایک نظر ڈالئے، مغرب نے ''روسو'' (Rousseau) کے نظریات کو ان کے انتہا پسندانہ رجحان کے ساتھ قدم آگے بڑھایا، اور سیاست میں ''میکا فیلی'' (McPhail) نظریہ کو قبول کیا، اور مغربی اہل قلم دانشوروں اور مصنفین نے اپنے قلم زور سے ان نظریات کی ایسی دلپذیر تشریح اور اشاعت کی کہ مشرق کے دانشور اس سے متاثر ہوئے اور وہ بھی ایسے کہ وہ خود اس نظام کے داعی بن گئے، اس کے نتیجہ میں ایسا ماحول بن گیا کہ یہ محسوس ہونے لگا کہ اب اسلام کے پاکیزہ نظام پر عمل کرنا ممکن ہی نہیں رہا، اور ترقی کے زینے طے کرنے کے لیے تنہا مغرب سے استفادہ ضروری ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اب بھی ہمارے نوجوان اور طلبہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اپنے مغربیت زدہ اساتذہ کو مقتدا سمجھ کر ان سے یہی تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

رسول کریم (ﷺ) نے اس بات کی ممانعت فرمائی تھی کہ کسی طالب منصب کو عہدہ سپرد کیا جائے، اسی طرح آپ (ﷺ) نے دولت وجاہ کے حریصوں کے لیے یہ دروازہ ہی بند فرما دیا تھا، لیکن مغربی نظریہ، یہ تعلیم دیتا ہے کہ منصب کا مطالبہ کرنے والے بلکہ اس کے حصول کے لیے پوری تندہی کے ساتھ کوشش بھی کرنے والے کو دیدیا جائے، اس کے نتیجہ میں امیدوار منصب تمام ذرائع کو اختیار کرتا ہے، اور پروپیگنڈہ اور جھوٹ کا بازار گرم کر دیتا ہے تا کہ ہر حال میں اسی کو منصب حاصل ہو۔

اگر قسمت نے یاوری کی اور اس کو منصب مل گیا تو اس کی تمام کوششوں کا محور یہ ہو جاتا ہے کہ کن کن طریقوں سے دولت کے انبار لگائے اور مزید عہدے حاصل کرے اس کے لیے ظلم وزیادتی اور دھوکہ وچالبازی کے ایسے ایسے طریقے ایجاد کرتا ہے جو اس سے پہلے کسی کو بھی نصیب نہ ہوئے ہیں، اس طرح وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔

طرف تماشا یہ کہ اب عوام وخواص کا ذہن ودماغ ان چیزوں کا ایسا عادی ہو گیا ہے کہ وہ اسی کو میدان سیاست کا شہ سوار اور کامیاب سیاسی رہنما سمجھتے ہیں۔

مغربی پروپیگنڈہ نے صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح بنادیا ہے اور اسلام کے خلاف فضا تیار کر کے اسلامی نظریہ کو ایسا مشکوک بنادیا ہے کہ جس پر عمل کرنا گویا آج کی متمدن اور ترقی یافتہ دنیا میں ممکن ہی نہیں رہ گیا ہے۔

تاریخ

تاریخ کے موضوع کو لیجئے، اس موضوع کا سب سے اہم حصہ یورپ کی تاریخ کو سمجھا جاتا ہے، تعلیم گاہوں سے متعلق ہر فرد پر گویا یہ لازم ہو جاتا ہے کہ یورپ کی پوری تاریخ تمام جزوی تفصیلات کے ساتھ پڑھے اگر وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی تاریخ سے ناآشنا ہے تو کوئی عیب کی بات نہیں۔ رہی اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ تو اس کا نمبر سب کے بعد میں آتا ہے، اور وہ بھی ان مصنفین کی لکھی ہوئی پڑھائی جاتی ہے جو اسلام کی خوبیوں پر یقین ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کو بلا جانے ہوئے برا سمجھتے ہیں۔

جغرافیہ

یہی حال جغرافیہ کا ہے، مسلم طالب علم اپنی جامعات میں یورپ اور امریکہ کا جغرافیہ پڑھتا ہے، اسی کے ساتھ ان ممالک کا جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے، جن کی سیاسی و اقتصادی اعتبار سے اہمیت ہے، گہوارۂ اسلام اور مسلمانوں کے ملک کا جغرافیہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور نہ اس کی سیاسی یا اقتصادی اعتبار سے کوئی افادیت سمجھی جاتی ہے، رہے اخلاق اور دینی پہلو یا انسانی آداب و امتیازی صفات، وہ مغربی نصاب تعلیم کے تیار کرنے والوں اور تعلیمی نظام وضع کرنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہی رہتے ہیں۔

آج سے ایک صدی قبل جزیرۃ العرب کے جغرافیہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی، مواد تلاش کیا جاتا تو جس قدر مواد دوسرے دور دراز ملکوں اور علاقوں کے جغرافیہ پر مل جاتا جزیرۃ العرب پر اتنا بھی نہ ملتا، لیکن جب جزیرۃ العرب کی ریت اور پانی میں اللہ تعالیٰ نے سیال سونے کے دریا بہادیئے تو اس کا جغرافیہ بھی تیار ہونے لگا ہے۔

ادب و تنقید کے موضوع پر بے شمار کتابیں، مضامین ملیں گے ان میں سب کچھ ملے

گا، اگر نہ ملے گا تو اسلام کے اثرات کا تذرہ، کیوں کہ اس دنیا پر جن لوگوں کا تسلط رہا ہے ان کا تعلق اس گروہ سے ہے جو اخلاق و مذہب سے بیگانہ "فرائڈ" "سارٹر" (Sartre) کے افکار و نظریات کے دلدادہ اور ان پر نازاں ہیں۔

علم النفس

علم النفس اور علم تربیت تو "فرائڈ" اور "ڈارون" کے نظریات میں رنگے ہوئے ہیں، یہی حال ثقافت و تمدن کا ہے۔

یورپ کی تعلیم گاہوں اور مراکز تعلیم و تربیت کی اس حالت اور کیفیت کی وجہ سے وہاں جو نسل تیار ہوئی اس نے وہی کارنامے انجام دیئے، جس کی توقع اس نظام تعلیم و تربیت سے تھی، وہاں برپا ہونے والی سیاسی و سماجی معرکہ آرائیاں دین و حکومت کی آویزش اور اخلاقی و سماجی انارکی، یہ سب اسی نظام کے ثمرات ہیں۔

مشرقی ذمہ داروں کا فریضہ

لیکن مشرق جو فضائل زندگی کی دولت سے فیضیاب تھا اسے یورپ کی اندھادھند پیروی کی ضرورت نہیں تھی، اسلام نے اس کے ہر شعبۂ زندگی کے لیے تعلیمات اور اصول و ضوابط عطا کر رکھے تھے، ایسی مستقل بنیادیں اس کو فراہم کر دی تھیں، جن پر انسانی زندگی کی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کی جا سکتی تھیں۔

لیکن یورپ کے بے بنیاد نظریات جو مغرب سے چل کر مشرق میں داخل ہوتے ہیں انہیں ہمارے مراکز تعلیم و تربیت بڑے فخر و اعزاز کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص سنگریزوں اور ریت کو ملا کر دیوار بنا لے اور اس کے سایہ میں آرام کرے، آخر یہ دیوار اسی کو دبا کر ختم کر دے گی۔

سب سے بڑی ذمہ داری اس سلسلہ میں ہماری تعلیم گاہوں کی ہے جنہوں نے اب تک اس حقیقت کو نہیں پہچانا کہ انہیں اپنے نصاب تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت ہے، فاسد اور انسانی حسن و کمال سے خالی نصاب کو چھوڑ کر ٹھوس اور صالح نصاب تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

اسلامی معاشرہ کے امتیازی پہلو

اور

اس کو درپیش خطرات

قومی مزاج اور ثقافت کی ضرورت

کسی قوم کی ثقافت اس کی زندگی کا ایک طرز اور امتیازی نشان ہے وہ ایک قوم کو دوسری قوم سے علاحدہ شناخت عطا کرتی ہے، اور اس کی امتیازی پہچان بھی بنتی ہے، اور قوم کی تہذیبی اور تمدنی ترقی کی نشانہی بھی کرتی ہے۔

ثقافت کوئی ایسا لباس نہیں ہے جو دوسروں سے مستعار لے لیا جائے، ثقافت کا خمیر، قوم کی داخلی زندگی سے بنتا ہے، زندگی کی قدریں اور تصورات اس کے تانے بانے تیار کرتے ہیں، اور اس کے خدوخال متعین کرتے ہیں، لہٰذا جو قوم اپنی زندگی کے اندرون اور اس کے حقیقی تصورات سے اپنی ثقافت وضع کرنے کی قدرت نہیں رکھتی، اس قوم کی اپنی کوئی شناخت نہیں ہوتی، اس کی شخصیت کسی دوسرے کی تابع ہوتی ہے مستعار لئے ہوئے اخلاق اور بے میل تصورات کا پیوند اس پر لگا ہوتا ہے، اور یہ اس قوم کی دورنگی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

مغرب کے اثر سے ثقافت اسلامی متأثر ہوئی

مشرقی قومیں اور ماضی قریب میں مسلمان قوم بھی ثقافت کی دورنگی کا شکار ہوئی، یہ

سانحہ اس وقت پیش آیا جب مغربی یلغار نے اپنے تہذیبی وقومی تصورات کو اپنی مفتوح اقوام کی ثقافت وفکر میں داخل کردینے میں کامیابی حاصل کی، مغربی تہذیب کی چمک دمک نے مشرقی اقوام کی نگاہوں کو اس درجہ خیرہ کردیا کہ پھر وہ یہ نہ دیکھ سکیں کہ خود ان کی خاکستر میں کیسی چنگاریاں پوشیدہ ہیں اور کیسے کیسے فکری اور ادبی جواہر سے ان کا اندرون مالا مال ہے، اور خود ان کی شخصیت میں ایسی خصوصیات مخفی ہیں جو ان کو دوسرے کا ریزہ چیں بننے کا محتاج باقی نہیں رکھتیں۔

مسلمان قوم کو دنیا کی تمام اقوام میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کا دامن ایک عظیم ثقافت کے عناصر سے بے انتہا مالا مال ہے، بلکہ اس کی خوبیاں تو دوسری کتنی ہی اقوام کو مالا مال کردینے کی صلاحیت رکھتی ہیں امت مسلمہ میں یہ صلاحیت اس سبب سے پیدا ہوئی کہ اس نے ایک اعلیٰ تہذیب وتمدن کے ساتھ زندگی گزاری، اس کے پاس آسمانی دین تھا اور اپنے افکار وآداب، اور یہی وہ اہم عناصر ہوتے ہیں جن سے کسی بھی قوم کی زندگی کا ثقافتی ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہوئی کہ مغربی تمدن کی جلوہ افروزیوں نے اس ممتاز قوم کے فرزندوں کی نگاہیں خیرہ کردیں جس کے اثر سے ان کے طائر فکر وخیال کی پرواز محدود ہو کر رہ گئی اور وہ اسی فضا میں قید ہوگئے جو مغرب کی تیار کردہ تھی اب انہیں وہی نظر آتا ہے جو مغربی زندگی انہیں پیش کرتی ہے، ذہن وخیال، شرافت وعزت پر مغرب کی چھاپ لگی، یہاں تک کہ مغرب کے بنائے ہوئے خول سے ان کا نکلنا ممکن نہ رہ گیا۔

امت مسلمہ نے خود اپنی ذات پر اعتماد کھویا، اپنی عزت واقبال کا احساس اس کے دل سے جاتا رہا، اس کی اپنی ذات اس کی نگاہ میں بے وقعت ہوگئی، اپنے قومی، ملی اور علمی سرمایہ اور میراث پر اسے ناز نہ رہ گیا، اپنی فکری، دینی ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کے روشن صفحات نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔

اسلامی بیداری کا آغاز

پھر مشیتِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ یہ زبوں حالی اب مزید دراز نہ ہو، مسلم دانشوروں

اور مفکرین کو توجہ شروع ہوئی اور انہیں اپنا بیش قیمت علمی وفکری سرمایہ نظر آنا شروع ہوا، اور وہ پوری تندہی کے ساتھ اپنی فکری وثقافتی عظمت کی بازیافت میں مصروف ہو گئے، قوم کو بھولا سبق یاد دلایا، اور اس کو علم اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی کوشش کی، اسی کے نتائج ہیں جو آج ہماری آنکھوں کو مسرور کر رہے ہیں، اور قوم کے اندر شعور پیدا کر رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قوم میں اس بات کی فکر پیدا ہوئی اور مزید ہو رہی ہے کہ امت کی اصلاح کا سامان کیا جائے اور امت کے فکری، علمی اور ثقافتی ڈھانچہ کی تعمیر نو کی جائے۔

ثقافت کی تشکیل میں مذہبی واخلاقی اقدار کا حصہ

ثقافتی حکمت عملی وضع کرتے وقت یہ ضروری ہے کہ اس امت کے دین، اخلاق اور اس کے تصورات کو سامنے رکھا جائے اور اس سے غذا حاصل کی جائے۔

کسی بھی قوم کے ثقافتی ڈھانچہ پر دینی اثرات کا رنگ کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہوتا ہے جو سرسری جائزہ سے دکھائی نہیں دیتا لیکن ایک گہری نظر سارے حقائق کو بے نقاب کر دیتی ہے، اور وہ دینی رنگ ایک عیاں حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔

مغربی ثقافت پر عیسائی مذہب کے اثرات

مثال کے لیے مغرب کی مسیحی زندگی کو لیجیے، صلیب جگہ جگہ نظر آئے گی، عمارتوں اور مختلف تمدنی وثقافتی مظاہر میں صلیب کی شکل بنی نظر آئے گی، سرکاری وعوامی عمارتوں کے صدر دروازے اور گنبد گرجا گھروں کے دروازوں اور گنبدوں کی مشابہت کے لیے دکھائی دیں گے، صحت کے مراکز اور امدادی ورفاہی تنظیموں کے نشانات بھی صلیب کی شکل سے مشابہ ہوں گے، کبھی کبھی تو دیواروں کی بناوٹ میں بھی صلیب کارفرما ہوتی ہے، گلوں میں لٹکے ہوئے ہار، اور مغربی لباس کا خاص شعار ٹائی صلیب کی ہی جدید شکل ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو متمدن مغربی دنیا نے اور اس کے حواریین نے بڑی شدت اور پابندی سے اپنے طرز زندگی میں داخل کی ہیں، اور ان سے بیگانگی کو بے تہذیبی اور کم مائیگی تصور کرتے ہیں، حالانکہ سب خالص مسیحی مذہبی نشانات اور شعار ہیں۔

اسی طرح کرسمس کا جشن بہت بڑے پیمانہ پر منایا جاتا ہے ''گڈ فرائیڈے'' اور ''ایسٹر'' کے تہوار جو بڑے جوش وخروش سے منائے جاتے ہیں خالص مذہبی کردار اور حیثیت کے حامل ہیں۔

اسی طرح تعلیم میں سیکولر کردار کا نام لے کر پرائمری سے اعلیٰ تعلیم تک مختلف مذہبی شعار دکھائی دیتے ہیں جو ثقافت کی نقاب ڈال کر پیش کئے جاتے ہیں۔

مغرب کی دورنگی ملاحظہ ہو کہ وہ مشرقی تعلیم گاہوں میں مسجد کی تعمیر کو رجعت پسندی اور بنیاد پرستی کا نام دے کر مغرب کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں گرجا گھروں کی تعمیر اور مذہبی رسوم کی ادائیگی پر سختی کے ساتھ کاربند ہیں۔

یہودیت و ہندومت کے اثرات

یہودیوں کی زندگی میں تو مذہبی شدت پسندی انتہا درجہ پر ہے اسی کا ایک مظہر یہ ہے کہ پوری دنیا کے یہودی فلسطین میں اقتم اپنی جابرانہ وغاصبانہ حکومت کو بھرپور تعاون پیش کررہے ہیں، فلسطین کی غصب شدہ سرزمین پر یہودی بستیاں بسائی جارہی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی دعویٰ ہے کہ ہم سیکولر اور روشن خیال ہیں۔

ہندوستان کے ہندوؤں کا حال بھی اس سے مختلف نہیں، وہ قدیم مذہبی روایات اور طریقوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں، جن کا تعلق تقریبات سے زیادہ ہے چاہے وہ مذہبی تقریبات ہوں یا محض سماجی، ان کے رسم ورواج اور عبادت کے طریقے تنوع کے لحاظ تعجب انگیز ہیں وہ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظر آتے ہیں، تمام تر روشن خیالی کے دعوؤں کے باوجود وہ ان دیومالائی طور طریقوں پر قائم ہیں، اور یہ ان کی پوری زندگی پر اثر انداز ہیں، مغربی اقوام ہوں یا مشرقی اقوام، ان کی زندگیوں اور ان کے معاشرہ پر مذہب پوری طرح اثر انداز ہے، اور جہاں تک خود ان کا تعلق ہے وہ اسے نہ صرف گوارا کئے ہوئے ہیں بلکہ ان میں ان اثرات کو قبولیت بھی حاصل ہے، متمدن مغربی دنیا نہ صرف انہیں سرآنکھوں پر رکھے ہے بلکہ اس کی توسیع واشاعت بھی کرتی ہے۔

جب اسلامی ثقافت جو خرافاتوں سے پاک وصاف ہے اور بہت معیاری ہے اور صحت مندانہ، عملی ذہن کو متاثر کرنے والی اور زندگی کی تمام حقیقتوں پر محیط ہے، کا ذکر آتا ہے تو فوراً اس کو رجعت پسندی اور ظلمت پسندی کا نام دیدیا جاتا ہے اور اس کی مخالفت کرنا اپنا قومی فریضہ سمجھ لیا جاتا ہے۔

اسلامی ثقافت کے چار میدان کار

اسلامی ثقافت کے مظاہر چار بڑے گوشوں میں پھیلے نظر آتے ہیں۔

۱۔ دین اور اخلاق کا دائرہ۔

۲۔ سماجی زندگی کا دائرہ۔

۳۔ علم کے میدان۔

۴۔ ذوق اور احساس جمال کے گوشے۔

دینی میدان میں دیکھا جائے تو اسلامی ثقافت کے مظاہر، عبادتوں اور تعبدی کاموں کے سلسلہ میں نظر آتے ہیں، خوبصورت مسجدوں کی تعمیر، مساجد کی سرگرمیاں، وہاں آمدورفت، مذہبی خدمات میں مشغولیت مثلاً عیدوں کا اہتمام وانتظام، رمضان المبارک میں روزہ رکھنے والوں کی خدمت، حج اور اس کے شعائر کا اہتمام وانتظام خصوصاً حجاج کرام کی خدمت، وعظ کی محفلیں، اور ان کے انعقاد کی کوششیں، دعوت وتبلیغ کی مجلسیں اور سیرت کی مجلسیں اللہ اور رسول کے احکام کی روشنی میں مسلمانوں اور اسلام کی خیر خواہی، یہ سب اسلامی ثقافت کے دینی پہلوؤں سے وابستہ امور ہیں۔

اخلاقیات کو لیجئے، قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں ایسی ہدایات اور تعلیمات پھیلی ہوئی ملتی ہیں، اگر پوری دنیا کے اہل دانش وعقل جمع ہو کر کوئی ایسا مجموعہ تیار کرنا چاہیں، تو اس مجموعہ کے مساوی بھی لانا ان کے لیے کسی طرح ممکن نہیں۔

قرآن وحدیث کے سرچشموں سے تیار ہونے والے اخلاق حسنہ اور عمدہ انسانی کردار کے نمونے جستہ جستہ اوراق ذیل میں ملاحظہ کیجئے۔

اسلام میں فضول خرچی اور بخل دونوں سے منع کیا گیا ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

” وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوماً مَّحْسُوراً“(بنی اسرائیل:۲۹)

اور اپنے ہاتھ کو گردن سے بندھا ہوا نہ کرلو (بہت تنگ نہ کرلو کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) نہ بالکل ہی کھول دو (کہ سبھی کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو) کہ ملامت زدہ اور ماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔

عام زندگی میں سچائی، پاک دامنی اور امانت داری اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز تکبر، خود پسندی اور گھمنڈ کو چھوڑ کر اللہ رب العزت کے لیے تواضع اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی۔

قرآن کریم نے حضرت لقمانؑ کی زبانی یہ ہدایات نقل کی ہیں۔

”وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ“۔(لقمان:۱۸)

(اور از راہِ تکبر) لوگوں سے گال نہ پھلانا اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنا کہ اللہ کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں فرماتا۔

سماجی دائرہ اور مساوات

اولادِ آدم کے ساتھ مساوات اور تمام مسلمانوں کے ساتھ مخلصانہ اخوت کا حکم دیا گیا، تمام انسانوں کے ساتھ مساوات کا حکم حدیث نبوی میں ان الفاظ کے ساتھ دیا گیا ہے کہ:

”تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں، کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی کالے کو کسی گورے پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں سوائے اس کے کہ تقویٰ کی بنیاد پر کوئی افضل ہو“۔(۱)

ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے:

”لوگ آپس میں ایسے ہی برابر ہیں جیسے کنگھی کے دندانے“۔(۲)

---

(۱) مسند احمد؛ مسند الانصار حدیث نمبر ۲۲۳۸۸۵ (۲) کنز العمال ،باب محظورات الصحبة۔

ایک مرتبہ حضرت عمرو بن عاصؓ کے صاحبزادہ نے ایک مصری شخص کو یہ کہتے ہوئے مارا کہ "لو ایک شریف زادہ کے ہاتھ سے" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "خدائے برتر کی قسم تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا رکھا ہے، ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد پیدا کیا تھا"۔ (۱)

دوسروں کے حقوق کی ادائیگی اور رحم دلی

والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم قرآن مجید اور احادیث نبوی میں بار بار دیا گیا ہے، اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا کی وعید سنائی گئی ہے۔

اسی طرح صلہ رحمی، پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی، ایفائے عہد، راستہ سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنے، راستہ کا حق ادا کرنے، ہر جاندار پر رحم کرنے حتی کہ جانوروں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنے کے احکام دیے گئے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص کو مرنے کے بعد اس لیے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا کہ اس نے ایک بلی پر ظلم کیا تھا (۲) اور ایک فاحشہ عورت اس لیے جنت میں داخل کر دی گئی کہ اس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔ (۳)

زن و شوہر کے باہمی روابط اور ہمدردی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ شوہر اپنی رفیقہ حیات کے ساتھ اچھا سلوک رکھے، اور اس کے حقوق ادا کرے۔ (۴)

بیوی کی دلجوئی کرنے میں بھی ثواب رکھا گیا ہے یہاں تک کہ شوہر اگر نیک نیت سے بیوی کے منہ میں لقمہ بھی رکھتا ہے تو اسے آخرت میں اس کا اجر ملے گا۔ (۵)

کیا کسی مذہب میں بیوی کا اس درجہ اکرام اور عزت افزائی کی تعلیم ملتی ہے اللہ تعالی نے اس بات کا بھی حکم دیا کہ بیوی کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا رویہ رکھا جائے۔

---

(۱) کنز العمال، باب عدل عمرؓ۔ (۲) بخاری؛ کتاب المساقاۃ، باب فضل سقی الماء۔ (۳) مسند احمد؛ مسند ابی ہریرۃ، حدیث نمبر ۱۰۶۲۹۔ (۴) ابن ماجۃ؛ کتاب النکاح، باب حق المرأۃ علی الزوج (۵) بخاری؛ کتاب الوصایا، بات أن یترك ورثة أغنیاء خیر من أن یتکففوا الناس۔

رسول اکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی سیدھی نہیں کی جاسکتی (اس کو عین مرد کے مزاج کے مطابق کرنے کے لیے) سیدھا کرنا مناسب نہیں وہ ٹوٹ جائے گی، لہٰذا اس کے ساتھ اس کی اسی کمزور طبیعت کے لحاظ سے معاملہ کرو۔(۱)

عورتوں کے قافلوں کو لے چلنے والوں سے آپ (ﷺ) نے فرمایا ''نرمی اختیار کرو یہ آبگینے ہیں''۔(۲)

خود نبی کریم (ﷺ) اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ نرمی واخلاق کا معاملہ فرماتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تو آپ کا خاص معاملہ رہا کرتا تھا، ان کی دل جوئی کے لیے ان سے کھیل کے بارے میں بھی پوچھتے تھے، ایک دن تو آپ (ﷺ) نے کھڑے ہو کر حبشیوں کی نیزہ بازی کا کھیل دکھلایا۔(۳)

آپس کی ہمدردی

حضور (ﷺ) نے حکم فرمایا کہ چھوٹوں پر شفقت کی جائے، اور بڑوں کا احترام کیا جائے (۴) سلام کو رواج دیا جائے، اور آپ نے سلام کو باہمی محبت میں فروغ کا سبب بتایا (۵) سلام کرنا دراصل ایک دوسرے کو دعا دینا ہے اور یہ اسلامی ثقافت کا ایک مظہر ہے۔

رسول اللہ (ﷺ) باہمی مساوات کا حکم فرماتے تھے، خود جب کسی مجلس یا مجمع میں تشریف لاتے تو مجلس کے آخر میں جہاں جگہ ہوتی تشریف فرما ہوتے (۶) آپ کا فرمان تھا کہ لوگ آپ کے واسطے کھڑے نہ ہوا کریں۔

ابوداؤد کی روایت ہے کہ آپ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ ''تم اس طرح مت کھڑے ہوا کرو جس طرح عجمی کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں''۔(۷)

---

(۱) بخاری؛ کتاب احادیث الأنبیاء، باب خلق آدم و ذریته (۲) مسند احمد ابن حنبل؛ مسند انس بن مالك، حدیث نمبر ۱۳۶۷۷ (۳) بخاری؛ کتاب العیدین، باب الحراب والدرق یوم العید (۴) ابوداؤد؛ کتاب الادب، باب فی الرحمة (۵) السنن الکبریٰ للبیهقی، کتاب الشهادات، باب شهادة اهل العصبیة (۶) شمائل الترمذی؛ باب فی تواضع رسول اللہ ﷺ۔(۷) أبو داؤد؛ کتاب الادب، باب الرجل یقوم للرجل یعظم بذلك

اسلامی مساوات اور بھائی چارہ

رسول اللہ (ﷺ) نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایسی مواخات قائم فرمائی تھی جو رشتہ داری کی مواخات سے بڑھ کر محسوس ہوتی تھی، ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دیا اور فرمایا ''تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہ پسند نہ کرے، جو اپنے لیے پسند کرتا ہے''(۱) گویا آپ (ﷺ) نے مسلمانوں کے درمیان مواخات کو ایمان کا دارومدار قرار دیا۔

ان اخلاقی پہلوؤں سے مسلمانوں کا ثقافتی چہرہ ایک پسندیدہ اور دلکش صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مساوات، رحمدلی، مواخات اور انسانیت نوازی کا جاذب نظر مظہر سامنے آتا ہے، مومن کی پوری زندگی، حسن و جمال کا نمونہ اور سراپا خیر و برکت بن جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی مثال کھجور کے درخت سے دی ہے جس کا ہر ہر جزء لوگوں کے لیے نفع بخش اور خیر کا باعث ہوتا ہے۔

سماجی زندگی

سماجی زندگی میں دیکھئے تو اسلامی ثقافت کے نمونے جگہ جگہ نظر آئیں گے، خانگی زندگی، مدرسہ، مسجد، مجالس، بازار، تجارت اور سیاست ان سب میدانوں میں اسلامی تعلیمات کا گلستان کھلا نظر آئے گا۔

کاروبار میں امانت

تجارتی و صنعتی میدان میں آیئے، کسی مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ زیادہ منافع کمانے یا اپنا مال فروخت کرنے کے لیے دھوکہ یا چالبازی سے کام لے، یا سامان کی کسی خرابی کو چھپا کر اسے فروخت کردے، اگر ایک آدمی کوئی معاملہ کر رہا ہے تو اس پر معاملہ کرے، یا اپنی تجارتی سرگرمیوں کے ذریعہ دوسرے تاجر یا خریدار کو نقصان پہنچائے، اسی

---

(۱) بخاری؛ کتاب الایمان، باب من الایمان أن یحب لأخیه ما یحب لنفسه۔

طرح یہ بھی جائز نہیں کہ خزانوں اور مال و دولت کا انبار لگا لے اور فقراء و مساکین کا خیال نہ رکھے، اللہ تعالیٰ نے متعدد قوانین اور ضوابط کے ذریعہ مالیات کے نظام کو متوازن بنایا ہے۔

سیاسی میدان میں بے لوث خدمت

سیاسی میدان میں قدم رکھتے ہی اسلام سب سے پہلے یہ حکم دیتا ہے کہ منصب وعہدہ ایسے شخص کو نہیں سونپا جائے گا جو اس کا طالب اور مشتاق ہو، البتہ اگر بغیر طلب اور کوشش کے آجائے تو پھر قبول کرنا درست ہے، اس لیے کہ جو شخص عہدہ کا طلب گار ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں عہدہ کا اہل نہیں ہے لیکن اگر اسلام اور مسلمانوں کی کوئی اہم ضرورت پیش آجائے جو اسی کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہو تو عہدہ کو قبول کرنا اور فرائض کو انجام دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ (ﷺ) نے عہدہ کو امانت قرار دیا ہے جو عہدیدار کے ذمہ ہوتی ہے، نہ کہ منفعت کا ذریعہ جس سے صاحب عہدہ فائدہ اٹھائے۔(۱)

موجودہ سیاسی بگاڑ

آج کے دور میں موجود سیاسی بگاڑ اور فساد کا سرچشمہ یہی ہے کہ منصب وعہدہ کی خواہش عام ہو گئی ہے، اور اس کے حصول کے لیے ہر شخص بے چین ومضطرب ہے، جہاں عوامی رائے سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے وہاں عوام کو لبھانے اور رجھانے کے لیے ہر قسم کے ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں، اور ہر طرح کے جتن کیے جاتے ہیں، ہر صحیح وغلط وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے، نشر واشاعت اور پروپیگنڈہ کے مروجہ طریقہ سے پوری فضا آلودہ ہو جاتی ہے، جھوٹ، دھوکہ اور فریب کے ذریعہ اپنے حق میں رائے عامہ ہموار کی جاتی ہے یہاں تک کہ عوام کے دلوں سے برائی، غلط کاری کا احساس ختم ہو جاتا ہے، اور پوری قوم کا شرافتِ انسانی کا جذبہ مجروح ہو جاتا ہے، صدق اور راستی، پاکیزگی اخلاق وکردار اور عزت نفس جیسی صفات معدوم ہو جاتی ہیں اور اس انسان میں سے ایک تاجر اور ایک کاروباری کی شخصیت

(۱) مصنف ابن أبي شيبه؛ كتاب السير، باب في الامارة۔

ابھرتی ہے بلکہ ایک عیار اور ایک فریب کار کی تصویر سامنے آتی ہے۔

ڈکٹیٹر شپ کی ناپسندیدگی

اس جمہوری نظام کے متوازی ایک جابرانہ ڈکٹیٹر شپ نظام بھی ابھرتا ہے یہ نظام عوام وخواص، میں چاپلوسی، خودغرضی، اور تشدد وظلم کو فروغ دیتا ہے اس کے اثر سے قوم میں دو طبقے پیدا ہو جاتے ہیں ایک ظالم و جابر، دوسرا مظلوم و بےبس، ایک کا کام حکم چلانا دوسرے کا کام غلاموں کی طرح حکم بجالانا۔

ان ظالمانہ نظام ہائے حکومت سے نجات صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسلام کے عادلانہ نظام میں پناہ لی جائے اور اس کے نظریہ مساوات کو اختیار کیا جائے، انسان کو انسان سمجھا جائے اور ان ہی لوگوں کی قیادت منظور کی جائے جو خوف خدا رکھتے ہوں اور تقویٰ جن کا شعار ہو۔

اسلام میں علم کی اہمیت اور اس پر زور

اسلام میں علم کے حصول کے لیے بڑا زور دیا گیا ہے جس کی مثال دوسرے مذاہب میں نہیں ملے گی، اور نہ ہی کسی ایسے نظام ہائے زندگی میں ملے گی جو کسی خودساختہ مفکر کا تیار کردہ ہو۔

تعلیم کی اہمیت قرآن مجید کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت سے ظاہر ہوتی ہے، ''قلم''، علم کی سب سے بڑی اور بنیادی علامت ہے، اللہ تعالیٰ نے قلم کا ذکر اپنی پہلی وحی میں کیا ہے، قرآن مجید کے مختلف مقامات پر انسان کے لیے علم و تعلیم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

"وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا۔" (البقرۃ:۳۱)

(اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے اور ظاہر ہے کہ اسماء اور اصطلاحات میں ہی سارا علم پنہاں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔)

"عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔" (العلق:۵)

(انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اسے علم نہ تھا۔)

مزید ارشاد ہوتا ہے۔

"إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاء"۔ (الفاطر: ۲۸)

(اللہ سے اس کے بندوں میں سے جو صاحب علم ہیں وہی ڈرتے ہیں۔ جو صاحب علم ہیں وہی ڈرتے ہیں۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ۔" (آل عمران: ۱۹۱)

(اور آسمان وزمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے (اور کہتے ہیں) اے پروردگار تو نے ان کو بے فائدہ پیدا نہیں فرمایا، تو پاک ہے۔)

غور وفکر، علم وواقفیت سے دروازے کھولنے کا مؤثر طریقہ ہے پھر رسول کریم (ﷺ) نے صحابہ کرام کو حصول علم کی ترغیت دی، لکھنا پڑھنا سیکھنے کی ہدایت فرمائی، جس کے بغیر حصول علم ممکن ہی نہیں۔

علم کی دو قسمیں

ہمیں جس علم کی ضرورت ہے اس کو دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا تعلق آخرت سے ہے، یہ علم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کا اپنے رب سے کیا تعلق ہونا چاہئے، اس کے اعمال وافعال کے آکرت میں کیا نتائج مرتب ہوں گے، اودنیاوی زندگی کے جائز تقاضے کیا ہیں۔

یہ علم جس کا تعلق آخرت سے ہے انبیاء اور رسولوں کے ذریعہ سے آتا ہے، ان کے جانشین اور پھران کے پیروکار اس علم کو دوسروں تک پہونچاتے ہیں، اور اس کی اشاعت کرتے ہیں۔

سب سے آخری نبی اور رسول محمد (ﷺ) اس سلسلہ میں جو علم لے کر تشریف لائے اودنیاوی زندگی گزارنے کے لئے جو طریقہ آپ نے تعلیم فرمایا اور اس سلسلہ میں جو ہدایات دیں وہ آخری احکام قرار پائے جو ناقابل تبدیلی اور ناقابل تنسیخ ہیں ان احکام میں نہ کمی کی

جاسکتی ہے اور نہ زیادتی، صرف ان کی توضیح اور تشریح کا کام جاری رہے گا۔

دوسری قسم علم کی وہ ہے جس کا تعلق اس دنیا کی ضرورتوں اور انسانی زندگی سے ہے، یہ علم انسان کی عقلی و تجرباتی صلاحیت وفکر کی جولان گاہ ہے اس قسم کے سلسلہ میں رسول (ﷺ) سے فرمایا کہ یہ تمہاری دنیا کے امور سے ہے"۔

اس علم میں انسان اپنی فکر و عمل اور اپنے تجربوں سے وسعت پیدا کرتا رہتا ہے، اور نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، نئے نئے آفاق دریافت ہوتے رہتے ہیں، اسی علم کے ذریعہ انسان دنیا کا رخ متعین کرتا ہے، اس کے سربستہ رازوں کا انکشاف کرتا ہے، گویا راستہ کھلا ہے اور انسان اس پر قدم بڑھا رہا ہے، انسان کو اختیار ہے کہ اس علم سے جس قدر چاہے استفادہ کرے اور اس سے انسانیت کی خدمت کرے لیکن اس بات کا خیال رکھے کہ اسلام اور علم آخرت سے تعارض کی شکل نہ پیدا ہونے پائے، اسلام خود دنیاوی امور میں فکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے، قرآن وحدیث دونوں میں اس سلسلہ میں محنت وکاوش کرنے کا حکم دیا گیا ہ، چنانچہ مسلمانوں نے اپنے دور ترقی میں اس سلسلہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور اس علم کی نہ صرف یہ کہ تحصیل کی بلکہ اپنی تحقیق و تجربات سے اس علم میں غیر معمولی اضافہ کیا اور اس کے دائرہ کو مزید وسعت دی۔

مسلمانوں کی سستی اور مغرب کی چستی

لیکن پھر ایسا دور آیا کہ مسلمان عیش کوشی میں پڑ گئے اور اپنے فرائض سے کوتاہی برتنے لگے، دوسری طرف مغرب اپنی نیند سے بیدار ہونے لگا اور مسلمانوں سے حاصل کردہ علم سے فائدہ اٹھانے میں مصروف ہوگیا، علم کی اشاعت اس نے اپنا مقصد زندگی بنالیا نتیجہ ظاہر تھا کوشش کرنے والے کو اپنی محنت کا پھل ملا، اور علم وتحقیق کے میدان میں اس نے ترقی کے نئے نئے آفاق دریافت کئے حیات انسانی کے میدان میں اس نے ایک انقلاب برپا کردیا اسکی مادی ترقی اور جدید سائنسی انکشافات ن پوری نسل انسانی کو متاثر کیا اور ندگی گزارنے کے لئے نئے وسائل مہیا ہوئے۔

دین کی پابندی کے ساتھ یہ مادی ترقی مسلمانوں کے لیے کوئی شجر ممنوعہ نہیں اور اس سے گریز مسلمانوں کے لیے مفید بھی نہیں، ان کے دین ومذہب نے انہیں اس میدان میں کوشش کرنے کا حکم بھی دیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ۔" (الانفال: ٦٠)

اور جہاں تک ہوسکے ان کے مقابلہ کے لیے تیاری کرو جتنی طاقت تم سے بن سکے، اور گھوڑوں کا جتنا نظم ہوگا اس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ڈرا سکتے ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم بھی اپنے دشمنوں جیسے اسلحوں سے لیس رہو، اللہ تعالیٰ نے اس دنیا سے صالح طریقہ پر انتفاع کا حکم بھی دیا ہے فرماتا ہے:

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ۔"

(الاعراف: ٣٢)

(پوچھو تو کہ جو پسندیدہ اور بھلی لگنے والی اور رزق کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں ان کو حرام کس نے کیا۔)

ضرورت اور حالات کا تقاضہ

یہ تمام چیزیں ہم سے تقاضہ کررہی ہیں کہ ہم اپنے دنیاوی امور میں اس نئی پیش رفت سے بھرپور فائدہ اٹھائیں، اپنی ثقافت کو اور آراستہ کریں خدائے عزوجل نے دنیا کی اچھی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اس استفادہ کے لیے جو حدود مقرر کردیئے گئے ہیں ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔

عورت کی بے محابا آزادی

مغربی تہذیب وتمدن کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ عورت کو آخری درجہ

تک آزادی دے دی گئی ہے ایسی کھلی چھوٹ قدیم رومی اور یونانی تہذیب سے ضرور میل کھاتی ہے لیکن اسلام سے وہ جوڑ نہیں کھاتی، اس لیے ہمارے لیے نہایت ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہمیں اسلام کے قائم کردہ حدود معلوم ہوں، پھر ان حدود کی مکمل رعایت کی جائے، مغرب میں دین کو عبادت گاہوں میں محدود تصور کیا جاتا ہے لیکن اسلام میں دین کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے، وہ صرف مسجدوں تک محدود نہیں۔

ثقافت کے میدان میں بھی ہمیں اس اہم نکتہ کو سامنے رکھنا ہوگا دیگر علوم وفنون میں بھی ہمیں اس کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ وہ اسلامی تعلیمات سے ٹکراتے نہ ہوں، الٰہی قانون اور حدود سے آزاد اور بے راہ رو نہ ہوں۔

ادب اور دیگر فنون میں ہمیں کس حد تک آزادی حاصل ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے نبی اکرم (ﷺ) کی حیات طیبہ اور تعلیمات پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا۔

جہاں تک ادب اور دیگر فنون کا تعلق ہے اس میں ذوق فنی کو کام میں لانا ہوتا ہے، اور وجدان سلیم پر اعتماد کرنا ہوتا ہے، اس میں اسلامی ثقافتی اصولوں سے خاطر خواہ رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے، رسول اللہ (ﷺ) نے ایک موقع پر مشہور شاعر امیہ بن ابی الصلت کے اشعار سنے اور مزید سنانے کی فرمائش کی تھی، یہ اسی ذوق سلیم کا نمونہ ہے، آپ (ﷺ) نے فرمایا: "ان مــــن الشعر لحكمة" (۱) کہ شاعری میں وہ باتیں بھی ہوتی ہیں جو اچھے اخلاق و کردار کی ہوتی ہیں۔

رسول اللہ (ﷺ) نے اگرچہ خود شعر نہیں کہے لیکن آپ (ﷺ) کا نثری کلام بلاغت کا بہترین نمونہ تھا، آپ (ﷺ) کے نثری کلام کا شمار عربی ادب کے سب سے بلیغ اور دلکش نثر کے طور پر ہوتا ہے آپ (ﷺ) کی ذات گرامی اپنے لباس، عادات واطوار اور اخلاق میں حسن و جمال کا پیکر تھی، آپ (ﷺ) نے فرمایا تھا "اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے"۔ (۲)

آپ (ﷺ) نے صفائی کا حکم دیا، آپ خود نہایت صاف رہا کرتے تھے۔

آپ (ﷺ) کا حسن ذوق آپ (ﷺ) کے کلام میں جھلکتا ہے، واقعہ بیانی ضرب

---

(۱) سنن ابن ماجہ؛ أبواب الأدب، باب الشعر (۲) مسلم؛ کتاب لایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ

الامثال کا بیان، الفاظ کا انتخاب اور معانی کی دلکشی اس سے عیاں ہوتی ہے، ایک مرتبہ آپ (ﷺ) نے عورتوں کے قافلہ کو لے کر چلنے والوں سے فرمایا"رویدك رفقا بالقواریر" (ذرا آہستہ روی سے کام لو یہ آبگینے ہیں)۔

غزوہ اوطاس میں جب جنگ میں شدت آئی تو فرمایا"الآن حمی الوطیس" (۱) (اب زوروں کا رن پڑا ہے)

ابوعمیر نامی ایک بچہ تھا اس کا پالتو پرندہ مر گیا تو آپؐ نے فرمایا"أبا عمیر ما فعل النغیر" (۲) (ابوعمیر تمہارے پرندے نغیر کا کیا معاملہ ہے)۔

جہاں تک فنون کی دوسری اقسام کا تعلق ہے تو ان میں بعض عہد نبوی میں رائج نہ تھیں، ان میں بعض قسمیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا سے مناسبت نہیں رکھتیں، اور کسی طرح کا ان کا دین سے کوئی جوڑ بھی نہیں ہے بلکہ محض تفریح اور لہو ولعب کی چیزیں ہیں، جن سے شغل کرنا وقت اور مال کا ضائع کرنا ہے اور ان کو اسلام سے نے حرام قرار دیا ہے۔

ثقافتی میدانوں کا یہ ایک مختصر اور سرسری جائزہ تھا جو پیش کیا گیا اور اسی کے ذیل میں اسلامی ثقافت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا کہ ثقافت اور تمدن کے باب میں اسلام کیا پسند کرتا ہے اور کس طرح کی ثقافت کو وہ رائج کرنا چاہتا ہے۔

مسلمانوں کی بے عملی اور غیروں سے مرعوبیت

صحیح اسلامی زندگی ہی دراصل اسلامی ثقافت ہے اگر مسلمان صحیح اسلامی زندگی گزارنے لگ جائیں تو یہی اسلامی ثقافت کا نمونہ ہوگا۔

بعد کے مسلمانوں کی عملی کوتاہیوں کی وجہ سے اسلامی ثقافت کی تشکیل جدید پوری طرح عمل میں نہیں آئی، جب کہ ثقافت تربیت کا اہم ترین وسیلہ ہے، موجودہ عہد میں ہمیں مسلمانوں کی حالت نہایت خستہ اور زبوں نظر آتی ہے ان کی موجودہ ثقافت ایسی ہے کہ اسے

---

(۱) احمد؛ مسند العباس بن عبدالمطلب (۱۷۷۶) (۲) أبوداؤد؛ کتاب الادب، باب فی الرجل یتکنی ولیس له ولد۔

دیکھ کر ایک غیر واضح اور غیروں سے مستعار لی ہوئی تصویر سامنے آتی ہے، بلکہ اس سے حد درجہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس ثقافت سے ابھرنے والی تصویر یہودیت، مجوسیت، مسیحیت، اور دیگر مذاہب کا رنگ پیش کرتی ہے، اگر چہ کبھی کبھی اس سے اسلامیت بھی جھلک جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین کی عطا کردہ ثقافت کو مکمل طور پر اختیار نہیں کرتے۔

صحت مندانہ ثقافت کے حصول کے لیے تربیتی نظم

اسلامی ثقافت کی سچی تصویر اسی وقت ظاہر ہوگی، جب تربیت کے وسائل کی اصلاح کی جائے گی، اس اصلاح کے کئی میدان ہیں۔

۱۔ گھر، ۲۔ مدرسہ، ۳۔ ذرائع ابلاغ۔

ذرائع ابلاغ پر اہل علم وادب کا تسلط ہوتا ہے اور لوگ اپنی پسند و مصلحت کے تحت ان کا استعمال کرتے ہیں جو ہم بھی کر سکتے ہیں اور گھر کا ماحول تو اپنی قدرت واختیار میں ہے، اسی طرح مدرسہ کے ماحول کو بھی صحیح اسلامی ثقافت کے نشوونما کے لیے کام میں لانا آسان ہے اس طرح وہ ثقافت تیار ہوگی جس کے ذریعہ مسلمانوں کی زندگی ان کے کردار، رجحانات اور تعمیری عملی شکل کی پاکیزہ تصویر سامنے آئے گی۔

دو محاذوں پر کام کی ضرورت

صحیح اسلامی ثقافت کی حکمت عملی اسی وقت پیدا ہوگی جب یہ ثقافت امت اسلامیہ کی حقیقت سے وابستہ ہوگی، اس کے لیے دو محاذوں پر کام کرنا ہوگا۔

ایک محاذ ہے امت کی حفاظت کا یعنی غیر اسلامی ثقافتوں کی گندگیوں سے اس امت کو محفوظ رکھا جائے۔

دوسرا محاذ جو بنیادی محاذ ہے، ایسے مفید وسائل کا اختیار کرنا ہے جن کے ذریعہ اسلامی ثقافت کی سچی تصویر ابھرے، ذمہ داری کا آغاز گھر سے ہوتا ہے، گھر ہی وہ پہلا میدان ہے، جہاں والدین کے ہاتھوں بچہ کی شخصیت تشکیل پاتی ہے، گھر میں پیش آنے والی ہر بات بچہ کے ذہن ودماغ پر اثر انداز ہوتی ہے، اور اچھے برے تصورات کو جنم دیتی ہے، والدین

جس چیز کو پسند کرتے ہیں بچہ بھی انہیں پسند کرنے لگتا ہے، اور والدین جسے ناپسند کرتے ہیں، بچہ کے لیے بھی وہ ناپسندیدہ ہو جاتی ہے، بچہ کی ثقافت کی تشکیل کا اساسی مرحلہ یہی گھر ہوتا ہے، والدین جن شخصیتوں کا محبت وعقیدت سے ذکر کرتے ہیں وہ بچہ کے دل ودماغ میں محبوب ہو کر پیوست ہو جاتی ہیں، بہادر شخصیتوں کے بہادرانہ کارنامے، ماضی وحال کے عبقری افراد کے احوال بچہ کی عقل پر بہت گہرا اثر چھوڑتے ہیں، ایک مسلمان بچہ کے لیے اسلام کے جانباز سرفروشوں اور سابقہ اقوام کی مثالی شخصیات کے واقعات بہترین غذا کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً گذشتہ انبیاء اور رسولوں کے قصے علماء سلف کے واقعات وغیرہ۔

پہلے ہمارا معاشرہ ان چیزوں کا اہتمام کرتا تھا، مائیں اور دادیاں بچوں کو ایسے قصے سناتی تھیں جن سے بچوں کو انبیاء کرام، صحابہ اور دیگر بزرگان دین کے کارناموں کا علم ہو جاتا تھا لیکن اب یہ چیز ختم ہوتی جارہی ہے۔

بہر حال بچہ کی تعلیم وتربیت میں یہ بات مطلوب ہے کہ صالح اسلامی مظاہر اور اقدار پر توجہ دی جائے اور ان سے استفادہ کر کے بچہ کی ذہنی نشوونما کا اہتمام کیا جائے۔

پہلا محاذ مضر ذرائع ابلاغ سے بچاؤ کی تدبیر

پہلے محاذ کو لیجیے تو نظر آتا ہے کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو اپنے ہیجان خیز پروگراموں کے ساتھ گھر گھر میں داخل ہو چکے ہیں، اور معاشرہ پر بری طرح اثر انداز ہورہے ہیں، والدین اس سلسلہ میں اب صرف اتنا کام کر سکتے ہیں کہ ممکنہ حد تک بچوں پر نگرانی رکھیں، اور ان ہی پروگراموں کو دیکھنے کی اجازت دیں جو سیرت واخلاق کے لیے مفید ہوں اور زندگی کا پاکیزہ تصور پیش کرتے ہوں۔

آج ویڈیو اور ٹیپ ریکارڈوں کے ذریعہ بڑے پیمانے پر اخلاقی بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، اسلامی ثقافت کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں، اس موقع پر نہایت ضروری ہے کہ ہم کوئی راہ تلاش کریں، گھر کے ذمہ داروں کے لیے ممکنہ حد تک یہ چیز دشوار نہیں ہے، اس کے علاوہ اخبارات اور فحش لٹریچر الگ غضب ڈھا رہے ہیں، یہ رسالے اور اخبارات گھروں میں آتے ہیں تو بڑے

اور چھوٹے سبھی افراد پڑھتے ہیں، سن رسیدہ افراد تو ان کے برے اثرات سے خود کو محفوظ کر لیتے ہیں لیکن نوعمر افراد پر ان کے اثات بدمرتب ہو ہی جاتے ہیں اور اس سلسلہ میں افسانوں اور ہیجان خیز ناولوں کے اثرات کچھ زیادہ ہی ہو رہے ہیں۔

ان تمام چیزوں پر ہماری نظر ہونا چاہئے اور اپنی نسل کی تربیت میں مشغول رہتے ہوئے ان پر توجہ ہونا چاہئے اور ان کے مداوا کی حتی المقدور فکر کرنا چاہئے۔

مدرسہ کے معاملات کو لیجئے تو گھر کے کاموں اور ذمہ داریوں پر اتنا اور اضافہ کیا جائے گا کہ وہاں کے نصاب تعلیم، اجتماعی آداب اور ثقافتی پروگرام وغیرہ پر بھی توجہ دینی ہوگی، خصوصاً وہ پروگرام جنہیں اس ماحول میں پروان چڑھنے والا ہر طالب علم انجام دیتا ہے، اور جن سے ہر طالب علم ابتدائی درجات سے لے کر انتہائی درجات تک گزرتا ہے۔

دوسرا محاذ، مؤثر ذرائع ابلاغ کا استعمال

اسلامی ثقافت کو مضبوط اور مؤثر بنانے کے لیے دوسرا محاذ ذرائع ابلاغ کا ہے، اس میں ریڈیو، اخبارات، ٹیلی ویژن اور نشر و اشاعت کے دیگر وسائل شامل ہیں، افراد کی تعلیم و تربیت، عادات کی اصلاح اور دیگر تصورات و تخیلات کو پیدا کرنے میں یہ سب اہم کردار ادا کرتے ہیں، کسی بھی قوم کی ثقافتی زندگی کے بڑے حصہ پر یہی ذرائع ابلاغ چھائے ہوئے ہیں، اور اس وقت افراد امت کے قلوب ان کی زد میں ہیں، جب سے یہ وسائل عام ہوئے ہیں اور لوگوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کیا ہے، لوگوں کے رجحانات، میلانات اور افکار انہی وسائل کے تابع ہو گئے، ہم جب تک ان وسائل پر تصرف کا حق و اختیار نہیں حاصل کر لیتے اور ان کو اپنے مقاصد و اغراض اور ضروریات کے مطابق استعمال کرنے کی حیثیت میں نہیں آجاتے اس وقت تک ہم اپنی نسل کو اس رنگ میں نہیں رنگ سکتے جو ہمارے دین، عقیدہ اور ثقافت کے مطابق ہو۔

دراصل اس کام کی ذمہ داری مسلم حکومتوں پر عائد ہوتی ہے، اور ان حکومتوں کے ذرائع ابلاغ کے وزراء کی یہ ذمہ داری ہے، اگر یہ لوگ واقعی اس ضرورت کی تکمیل کا جذبہ

رکھتے ہوں اور امت مسلمہ کی اصلاح چاہتے ہوں تو پھر ان کے لیے مناسب تجویز یہ ہے کہ مخلص اور غیور اصحاب علم و فضل کی ایک کمیٹی تشکیل دیں جو ایسے مسائل میں غور و خوض کے بعد فیصلہ کرے اور اپنے متعین کردہ اصولوں پر ذرائع ابلاغ کو چلائے اور جدید امور پر ذمہ داروں کو تعاون پیش کرے، اور یہ وزارتیں بھی کوئی فیصلہ کرتے وقت امت اسلامیہ کے آئندہ مصالح کا پورا خیال رکھیں۔

معاشرہ کی موجودہ کمزوریاں

اوران کا علاج

اس وقت اسلامی معاشرہ کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے، اور یہ کوئی نئی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ گزشتہ زمانوں میں بھی برابر پیش آتی رہی ہے، کیونکہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ اسلامی معاشرہ کو مختلف قسم کے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا، اسی طرح آج بھی اسے متعدد چیلنجز درپیش ہیں، یہ چیلنج اور مسائل ہر زمانے میں اپنوں کی جانب سے بھی اور غیروں کی جانب سے بھی پیش آتے رہے ہیں، جن سے اسلامی معاشرہ پر اثر پڑتا رہا ہے اور دانشوروں اور مصلحین نے ان کا مقابلہ کیا ہے، آج بھی بعض ایسے چیلنج اور مسائل پیش آرہے ہیں جن کے دباؤ سے امت مسلمہ کو اپنی ذمہ داری اور قیادت وہدایت کے فریضہ کو بخوبی ادا کرنے میں رکاوٹ پیش آرہی ہے، جب کہ اسلامی اقدار، عقائد وآداب (اگر ان کو اپنایا جائے) تو ان میں امت مسلمہ کے انحراف وروگردانی سے بچاؤ اور ان کی حفاظت کے لیے پوری طاقت وصلاحیت موجود ہے۔

آج اسلامی معاشرہ اپنی اصل سے منحرف اور انحطاط کا شکار ہے اس کا حال ایسے گھر کی طرح ہوگیا ہے جو حالات زمانہ اور اپنوں کی بےتوجہی سے کہنگی اور کمزوری کا شکار ہورہا ہو، وہ اس میں رہنے والوں کی نہ تو گرمی سے حفاظت کررہا ہو اور نہ ہی بارش سے، اس کے رہنے والوں نے اسے درست کرنے کا ارادہ کیا ہو اور اس کی درستگی اور مرمت کرنے کی کوشش کی ہو اور اس کے لیے دوستوں سے تعاون لیا ہو، اور دشمنوں سے بھی سامان حاصل کیا ہو، اس طرح انہوں نے بعض شگاف تو بند کردیے ہوں لیکن ایسے اینٹ اور گارے سے

جو باہم میل نہیں کھاتے، اور ایسے پتھروں سے اس کی مرمت کی ہو جو اس کی ضرورت کے سائز کے نہ تھے، چنانچہ اس مکان کو بھونڈے طریقے سے سنبھال لیا ہو لیکن اس طرح انہوں نے اس کی حالت بگاڑ دی ہو اور یہ ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب امت مسلمہ دنیا کے اکثر حصوں میں پھیل گئی ہے اور اسلام کے ماننے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا ہے اس وقت ان کی آبادی دنیا کی چوتھائی آبادی کے قریب ہو گئی ہے، اسی بنا پر معاندین اسلام ان کی بڑھتی ہوئی تعداد کو ڈر کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں اور ان کو علاقائی خصوصیات کی بنا پر ایک ایسی طاقت تصور کرنے لگے کہ دنیا کے بعض علاقے ان کے اثر وطاقت، ہیبت اور وزن کے تعلق سے پہچانے جانے لگے، اسی کے پیش نظر اسلام کے مخالفین نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازشیں شروع کر دیں، اور ان کے تشخص کو ختم رکھنے اور ان کے امتیاز کو مٹانے کے منصوبے بنائے، اور ان کی معاشرتی طاقت ووحدت کو پراگندہ کرنے کی تدبیریں کیں، یہ معاشرتی طاقت ووحدت ان کے لیے وہ ذریعہ رہی ہے جس سے ایک طرف ان کی افاظت رہی ہے دوسری طرف وہ برے حالات میں ان کے لیے مدد وقوت بنتی رہی ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت

اس روئے زمین کے الگ الگ حصوں میں مسلمان جداگانہ ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں، بعض ملکوں میں تو وہ اکثریت میں زندگی گزار رہے ہیں اور بعض میں ان کی حیثیت اقلیتی فرقہ کی ہے، ان میں بعض اقلیتیں اپنے سیاسی رسوخ اور معنوی طاقت وقوت کی بنا پر بہر حال کچھ بہتر حالت میں ہیں لیکن کچھ ملکوں میں ان اقلیتوں کی حالت ناقابل بیان ہے، اور ان کا بہت ہی برا حال ہے، مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں ان میں بھی اکثر کی حالت بہت اچھی نہیں ہے اس لیے کہ انہوں نے اپنے ان ملکوں میں اپنے ملی تقاضوں اور حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی متوازن اسلامی سوسائٹی کی تعمیر وتشکیل نہیں کی، اور نہ ہی ان کے اندر انہوں نے اسلام کے اصل اور بنیادی تقاضوں کا خیال رکھا، اس بنا پر ان کا معاشرہ نہ تو قاعدے سے قدیم طریقہ کا مشرقی ہو سکا اور نہ ہی جدید اصول

سے مغربی، اور نہ ہی وہ اصول ومزاج کے لحاظ سے صحیح اسلامی معاشرہ بن سکا، وہ دوسرے معاشروں کے پیوندوں سے آراستہ معاشرہ بنا، اس پیوند کاری سے ملت اسلامیہ کوکوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں پہونچ سکا، یہ معاشرہ نہ تو اسلام کے اصل رنگ میں رنگا، اور نہ ہی وہ فساد وبگاڑ کے اثرات سے محفوظ رہ سکا۔ چنانچہ وہ ایک ایسے مکان کی طرح ہوگیا، جو اپنے مکین کی نہ تو مصیبتوں سے حفاظت کرسکتا ہو اور نہ ہی اسے دشمن کے خطرہ سے محفوظ رکھ پاتا ہو۔

مسلم اقلیت کا معاشرہ

اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو ملت اسلامیہ جہاں جہاں اقلیت میں ہے وہاں اس کے زعماء نہ تو اپنے لوگوں کے لیے اقتدار وحکمرانی کے شعبہ میں کوئی مضبوط گرفت رکھتے ہیں، اور نہ ہی اپنی خواہش اور منصوبوں کے مطابق وہ سماج کی تشکیل کرپاتے ہیں، اس لیے کہ وہاں ان سے مختلف مقاصد ومزاج رکھنے والی اکثریت حکمراں ہے، اور حکمراں ہونے کی وجہ سے تعلیم اور ذرائع ابلاغ کے اداروں پر اس کا تسلط ہے، جو کسی بھی سماج کی تعمیر کے لیے بہت ہی اہم ذرائع ہوا کرتے ہیں، ان دونوں پہلوؤں کے ہاتھ میں نہ آنے اور موافق نہ ہونے کے بعد صرف ایک قومی ڈھانچہ بچتا ہے جو ہر باہری حملہ کا نشانہ ہے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اس کو بھی متاثر کرتا رہا ہے اور ٹیلی ویژن کے سبب اب معاشرہ کی گھریلو زندگی بھی محفوظ نہیں رہی ہے، معاملہ والدین اور بڑوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے، وہ اور گھر کے دوسرے ذمہ دار اپنی اولاد کی زندگی کو صحیح رخ دینے اور ان کو فساد سے بچانے میں ناکام ہیں۔

ان حالات کی بنا پر اسلامی اقلیتیں پورے طور پر زبوں حالی کا شکار ہیں اور ان کا اسلامی تشخص، دین وثقافت اور ادب وفن سخت آزمائش اور بحران کے دور سے گزر رہا ہے، جس کے لیے انہیں اکثریتی قوموں کے ذہنوں کی غلامی کرنی پڑ رہی ہے، اس کی زندہ مثال وہ واقعات ہیں جو آئے دن اسلامی اقلیت والے ملکوں میں پیش آتے رہے ہیں اور پیش آرہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ اسلامی اقلیتوں کے اندر قائدانہ صلاحیت رکھنے والے بعض ہوشمند افراد اسلامی اقدار کی حفاظت کے لیے حکیمانہ ودانشمندانہ انداز اپناتے ہیں

اورانہیں اس راہ میں کامیابیاں بھی نصیب ہوئیں۔

ان سلسلہ میں ان کے سب سے اہم ذرائع مساجد ہیں جولوگوں کوروزانہ اور ہفتہ ہفتہ یا کم از کم سالانہ عبادتوں میں ایک جگہ اکٹھا ہونے کا موقع دیتی ہیں، اس کے علاوہ بعض مذہبی رسومات کے ذریعہ بھی وہ اپنے علماء سے دین حنیف کے نام پر رابطہ قائم کرتے ہیں اور وہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوتے ہیں، اس وجہ سے ان کا اسلامی معاشرہ کسی حد تک باقی ہے اگر چہ وہ اپنی ہیئت وحالت کے اعتبار سے خستہ حال ہورہا ہے، اور وہ پراگندہ اور بوسیدہ کیے جانے کا نشانہ ہے، اسی کے ساتھ دنیا کے بعض ملکوں میں بعض مسلم اقلیتیں ایسی ضرور ہیں جن کے اندر دینی اقدار کو متاثر کرنے والی اور اسلام دشمن طاقتیں پورے طور پر عمل دخل نہیں کرسکتی ہیں چنانچہ یہ اقلیتیں متعدد آزادیوں سے بہرہ ور ہیں، ان میں مدارس کے قیام کی خاطر خواہ آزادی ہے، وہ طبع واشاعت کے سلسلے میں بھی خودمختار آباد ہیں، یہ لوگ دوسری کمزور ومغلوب اقلیتوں کے مقابلے میں اچھی حالت میں ہیں لیک بہر حال ان کے مستقبل کے سلسلے میں ان کے ذہنوں کے اندر ضرور سوالیہ نشانات پائے جاتے ہیں، کیونکہ اسلام کو حریف سمجھنے کا خیال ایک عالمی شکل اختیار کر چکا ہے، لہٰذا انہیں کچھ علم نہیں کہ کب کیا ہوجائے۔

مسلم اکثریت کا معاشرہ

ان علاقوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اکثریت میں ہونے اور ملک کی زمامِ اختیار اپنوں کے ہاتھ میں ہونے کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ وہ ملی تقاضوں اور ضرورتوں کے لحاظ سے بھی محفوظ وماٗمون ہوں گے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ مغربی سامراج کے ان ملکوں سے نکلنے کے بعد بھی وہاں صحیح اسلامی تشخص بنانے کا کام نہیں ہوسکا، کیونکہ مغربی سامراج نے ان ملکوں میں اپنی پسند کے افکار وخیالات اور تہذیب وثقافت کے بیج اس طرح بودیئے ہیں کہ صحیح اسلامی فکر کے بحال ہونے کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں، دراصل مغربی سامراج نے اپنی حکومت کے دوران مشرقی اور اسلامی ملکوں کی نسلوں کی تربیت خالص مغربی تہذیب ومعاشرہ کی نہج پر کی اور ان ممالک کی سوسائٹی اور ان

کے اقدار کو مغربی اقدار کے قالب میں ڈھالنے کی پوری کوشش کی، پھر دینی، عقائدی اور ثقافتی گمراہیاں اس پر مستزاد رہیں، بہرحال مشرق کو متاثر کرنے میں مغرب کو خاصی حد تک کامیابی ملی، اس زاویہ سے اگر دیکھا جائے تو ان ملکوں سے مغربی سامراج کا ابھی پورے طور پر خاتمہ نہیں ہوا ہے وہ اگر کچھ ختم ہوا ہے تو صوری اور اصطلاحی طور پر ختم ہوا ہے، ثقافتی اور نظریاتی لحاظ سے ختم نہیں ہوا اور یہ مغربی سامراج وہاں سے اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک کہ ہم اس کو اپنے دماغوں سے نہ نکال دیں، یہی وہ ضروری کام ہے، جس کو کرنا مسلمانوں کے لیے بہت ضروری ہے، پھر یہ ضروری ہوگا کہ وہ اسلامی سوسائٹی کی تشکیل خالص اس کے بنیادی اور فکری نہج پر کریں، لیکن اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے امراض کی تشخیص کریں اور معاشرہ کی کمزوریوں کو تلاکریں اس کے بعد ہی ہم ان کا مناسب علاج اور مداوا کرسکیں گے۔

مدینہ منورہ کا مثالی معاشرہ

مذکورہ دونوں امور کے لیے ہم کو اولین اسلامی معاشرہ یعنی حضور (ﷺ) کے معاشرہ کی جانب لوٹنے کی ضرورت ہے، جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں اور مخالفانہ ماحول میں ہیں وہاں آپ کے مکی دور کا معاشرہ اور جہاں بااختیار ہیں وہاں مدنی دور کا معاشرہ، مدنی دور کا معاشرہ ایسا معاشرہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منور کے دس سالہ قیام کے دوران وجود میں آیا، ماہ وسال کو دیکھتے ہوئے تو یہ مدت بہت معمولی ہے لیکن اپنی معنویت اور حقیقت کے اعتبار سے وہ صدیوں پر بھاری ہے، یہ معاشرہ ان تمام اسلامی معاشروں کے لیے آئیڈیل اور نمونے کی حیثیت رکھتا ہے جو قیامت تک اس دنیا کے کسی بھی خطہ میں تشکیل پائیں۔

مدینہ منورہ کی اسلامی سوسائٹی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بہت سی بنیادوں اور اصولوں کے ساتھ قائم تھی، اس کے واقعات وحالات ہمیشہ کے لیے اسلامی معاشروں کے لیے مشعل کا کام کرتے رہیں گے، اور انہیں کی روشنی میں ہم اپنی اعلیٰ وادنیٰ زندگیوں میں پیش آنے والے واقعات ومسائل کو ڈھال سکتے ہیں، اسلامی سوسائٹی کے مختلف پہلوؤں پر خود حضور (ﷺ) کے نقطۂ نظر اور ارشادات اور آپ (ﷺ) کے اصحاب کرام کے پیش کردہ

حل سے تمام آنے والی نسلوں کو ہمیشہ ایک رخ اور ایک زاویۂ نظر ملتا رہے گا۔

حضور (ﷺ) مؤمنوں کو اپنے پالنہار، اپنے رب، اپنے خدا سے تعلق استوار کرنے اور پوری زندگی میں اسی تعلق کی درستگی کے لیے حکم دیتے تھے، اور آپ ان تمام فطری تقاضوں کا خیال رکھتے تھے، جن کے بغیر کسی انسان کا جینا مشکل ہے۔ ان کی عام زندگی کے لیے ان کی اجتماعی وانفرادی زندگی کے دائرہ میں غور وفکر کرتے تھے، اور سیاسی، اقتصادی، اور ثقافتی اغراض، الغرض ہر پہلو سے اس کی پوری رعایت کرتے تھے، آپ (ﷺ) ایسے دینی پیشوا اور رہبر تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت دینی ہدایت ورہنمائی اور اخلاقی تربیت واصلاح کے لیے مبعوث فرمایا تھا، اسی بنا پر آپ (ﷺ) اپنے پیروؤں کے عقائد کی درستگی اور ان کی دینی، سماجی اور اخلاقی کردار کی درستگی پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔

دین وعبادت کا پہلو

جہاں تک دین وعبادت الٰہی کا تعلق ہے تو اس پر خود بھی اور اپنے ماننے والوں کو بھی ایسی پابندی کرنے کا حکم فرماتے تھے کہ جس میں اپنے خدا سے ہمہ وقت تعلق ومحبت کا رشتہ استوار ہو جائے، فرائض تو فرائض ہیں مستحبات ومستحسن طریقوں کو بھی اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے، ایک حدیث میں آپ (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ''اس طرح خدا کی عبادت کرو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو جان لو کہ وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے'' (۱)۔ اور خود عملی طور پر کثرتِ عبادت کی مثال پیش کرتے تھے، یہاں تک کہ زیادہ نماز پڑھنے سے آپ (ﷺ) کے پیروں میں ورم ہو جاتا تھا اور جب آپ (ﷺ) سے کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے پچھلے اور اگلے گناہوں کو معاف فرمادیا ہے، تو آپ (ﷺ) اس قدر عبادت کیوں کرتے ہیں؟ تو آپ (ﷺ) فرماتے کہ کیا میں اپنے خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟! (۲) لیکن اس کے ساتھ جسمانی صحت وبقاء کا لحاظ کرنے کی طرف بھی تاکید کرتے تھے۔

چنانچہ آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ بیشک تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا

(۱) بخاری؛ کتاب الایمان، باب سؤال جبرئیل النبي ﷺ عن الایمان والاسلام۔

(۲) شعب الایمان للبیهقي؛ الثالث والثالثون من شوب الایمان، (٤٣٦٥)

تم پر حق ہے اور تمہاری جان کا تم پر حق ہے(۱) تو ہر ایک کو اس کا پورا حق دو۔آپ (ﷺ) صدقات کا حکم فرماتے تھے، اور اس کی تاکید کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ آگ سے بچو اگرچہ کھجور کی گٹھلی کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو(۱) آپ (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتے تھے اور فقر کی پروا نہیں فرماتے تھے۔آپ (ﷺ) زہد وتقویٰ وتوکل اختیار کرنے اور دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کو بہتر قرار دیتے تھے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی زندگی وقف کردے اور عبادت الٰہی کے لیے سب کچھ قربان کردے اس کو پسند فرماتے تھے۔ اصحابِ صفہ جو آپ (ﷺ) کی مسجد میں حصولِ علم کے لیے مقیم تھے، آپ (ﷺ) کے ساتھ بھوک کو برداشت کرتے تھے اور مستقل طور پر اقتصادی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے کم غذا پر ان کو اکتفاء کرنا پڑتا تھا۔آپ (ﷺ) کو جس قدر روزی میسر ہوتی تھی اس میں انہیں اپنے ساتھ شریک کرتے تھے، اور دین کے امور انجام دینے اور خدا کو بکثرت یاد کرنے کے سلسلے میں خاص اہتمام کا حکم فرماتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ آپ (ﷺ) کی مجلس میں ایک شخص پابندی سے حاضر رہتا تھا، جس کے بھائی زندگی کے مصارف کے لیے کمانے کی مشغولیت اختیار کرتے تھے اور خود پر اور اپنے اس بھائی پر خرچ کرتے تھے ان کے اس کمانے والے بھائی نے ایک روز رسول اللہ (ﷺ) سے شکایت کہ کہ اس کے یہ بھائی ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتے تنہا مجھ پر بوجھ پڑگیا ہے۔تو آپ (ﷺ) نے ان بھائی کے دین سیکھنے میں مشغول ہونے کی اہمیت بتاتے ہوئے فرمایا کہ شاید تمہیں اسی کی وجہ سے رزق دیا جارہا ہو(۳) یعنی بسا اوقات اللہ تعالیٰ ایسے اچھے ساتھی اور بھائی کی برکت کی وجہ سے ہی کمائی میں سہولت پیدا کرتا ہے، جو اپنے وقت کو دین کی تعلیم کے لیے صرف کرتا ہے۔

زندگی کا بنیادی پہلو

لیکن آپ (ﷺ) کا یہ کہنا دنیاوی تقاضے کو نظر انداز کرنے کے لیے نہیں تھا کیونکہ

---

(۱) بخاری؛ كتاب النكاح، باب لزوجك عليك حق(۲) كنز العمال،؛ باب في السخاء والصدقة
(۳) ترمذی؛ أبواب الزهد، باب في التوكل على الله

اسی کے ساتھ حضور کسی سے مانگ کر اپنی ضرورت پوری کرنے اور اپنے بوجھ کو کسی دوسرے پر ڈالنے سے بھی روکتے تھے، آپ (ﷺ) نے ایک شخص کو دیکھا جو لوگوں سے مانگ کر اپنی ضرورت پوری کرتا تھا، تو اس کو ایسا کرنے سے منع کیا اور اس سے پوچھا کہ اس کے پاس کیا سامان ہے، اس کے پاس ایک چادر اور ایک برتن تھا، آپ (ﷺ) نے اس کو نیلام کر دیا، پھر حاصل شدہ رقم سے ایک کلہاڑی خریدی جس سے وہ شخص لکڑی کاٹ کر فروخت کرے، تا کہ اس کے نفع سے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے پر قادر ہو سکے، اس سے معلوم ہوا کہ مال کا حصول اپنی ذاتی محنت سے کرنا چاہئے اور انسان کو دوسروں پر بوجھ نہیں بننا چاہیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کثرت عبادت کی جانب رغبت دلایا کرتے تھے، لیکن جب آپ (ﷺ) کو علم ہوا کہ تین صحابہ نے یہ قسم کھائی ہے کہ ان میں سے ایک شخص پوری رات عبادت میں گزارے گا، اور وہ راتوں کو نہیں سویا کرے گا، اور دوسرا شخص اپنا پورا دن روزہ میں گزارے گا، تیسرا شخص کبھی شادی نہ کرے گا اور عبادت کی خاطر تجرد کی زندگی گزارے گا، تو آپؐ نے اس سے منع فرماتے ہوئے فرمایا کہ میں تم میں سب سے زیادہ اللہ کا عبادت گزار بندہ ہوں رات کو عبادت کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزے رکھتا ہوں اور بغیر روزے کے بھی دن گزارتا ہوں، شادی کی ضرورت بھی پوری کرتا ہوں۔(۱)

آپ (ﷺ) حاکم (امیر) کی مکمل اطاعت کا حکم فرماتے تھے، لیکن جب آپ (ﷺ) کو پتہ چلا کہ ان کے امیر نے لوگوں کو آگ کے اندر گھس کر جل جانے کا حکم دیا، جس کی ان لوگوں نے حکم عدولی کی تو آپ نے ان کی اس حکم عدولی کو صحیح قرار دیا، اور فرمایا کہ اگر تم لوگ آگ میں داخل ہو جاتے تو کبھی اس سے نہ نکل پاتے (۲) یعنی جہنم کی آگ میں جانا پڑتا اور فرمایا کہ اگر خالق یعنی خدا کی معصیت کی بات ہو تو اس میں کسی بھی بندے کا حکم نہیں مانا جائے گا، آپ (ﷺ) زوجین کو باہم حقوق کی ادائیگی کا حکم فرمایا کرتے تھے، اسی طرح پڑوسی حاکم و خادم و غلام کے باہم حقوق کی ادائیگی پر زور دیا کرتے تھے۔

(۱) بخاری؛ کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح

(۲) أحمد؛ مسند علی بن أبی طالب(۶۲۲)

اپنی وفات کے وقت جہاں آپ (ﷺ) نے نماز کی پابندی کا حکم فرمایا وہیں غلاموں کے حقوق کی ادائیگی، عورتوں پر رحم دلی کا معاملہ کرنے نیز ان دونوں کے ساتھ حسن سلوک اور نرمی کے ساتھ پیش آنے کی تلقین بھی فرمائی۔ اور آپ (ﷺ) نے عورتوں کو ان کی کمزوری کے پیش نظر ان کی کمزوری کا لحاظ رکھنے کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ان کو شیشہ سے تشبیہہ دی کہ ان کے ساتھ نرمی برتو وہ آبگینوں کی طرح ہیں۔ آپ (ﷺ) نے اجتماعی زندگی کی حفاظت کا حکم فرمایا اور لوگوں کو اختلاف وتفرقہ بازی سے منع فرمایا اور فرمایا کہ جو جماعت سے کٹ گیا وہ جہنم میں جائے گا اور وہاں بھی علاحدہ جائے گا، اور فرمایا کہ بھیڑیا اس بکری کو کھا جاتا ہے جو ریوڑ سے علاحدہ ہو جاتی ہے۔

مسائل زندگی میں اعتدال وحکمت عملی کا لحاظ

حضور (ﷺ) اسلامی زندگی کے مسائل کے لیے حکمت کے پہلو کو اپناتے تھے، آپ (ﷺ) فوجوں کی خود تربیت فرماتے تھے، اور جنگ کے سلسلہ میں بہتر سے بہتر تدبیروں کو اختیار کرتے تھے اور دشمن کے فریب سے بچنے میں ذرہ برابر کوتاہی نہیں کرتے تھے، آپ (ﷺ) فرمایا کرتے تھے کہ مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ آپ (ﷺ) ہر کام کے لیے ساز وسامان اور حکمت وتدبیر کے ساتھ پوری تیاری کرتے تھے۔ آپ (ﷺ) نے اپنے صحابہؓ سے جبل احد کی جانب سے دشمنوں سے جنگ کرنے یا پھر مدینہ میں رہ کر ان کا دفاع کرنے کے سلسلے میں مشورہ کیا، اور جب آپ (ﷺ) نے دیکھا کہ صحابہ کی بڑی تعداد کی رائے شہر کی محفوظ فضا سے نکل کر شہر سے باہر میدان میں جنگ کرنے کی ہے، تو آپ (ﷺ) نے ان کی رائے کو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے زیادہ مدبرانہ نہ سمجھتے ہوئے بھی مان لیا، پھر یہ بھی تدبیر کی کہ کچھ تیرانداز ساتھیوں کو میدان جنگ سے متصل پہاڑی پر بیٹھنے کا حکم فرمایا تاکہ وہ دشمن کی نقل وحرکت پر نظر رکھ سکیں اور جنگ کے خاتمہ تک ان کو وہاں جمے رہنے کی تاکید کی، لیکن وہ لوگ جنگ کا پانسہ دشمن کے خلاف ہوتے ہوئے دیکھ کر بعد میں اس خیال سے وہاں سے ہٹ گئے کہ مسلمان غالب آرہے ہیں، اور کفار شکست کھا رہے ہیں، چنانچہ

مسلمانوں کواس غلطی کی وجہ سے زبردست نقصان کا سامنا کرنا پڑااور کچھ دیر کے لیے انہیں سخت ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا، اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن تدبیر اور جنگی مصلحت کو سمجھنے کا پتہ چلتا ہے۔ آپ (ﷺ) توکل کرنے کی نصیحت تدبیر وحکمت اختیار کرتے ہوئے کرنے کرنے کا حکم فرماتے تھے، آپ (ﷺ) فرماتے تھے کہ اونٹ کو باندھو پھر توکل کرو یعنی اونٹ کو باندھنے کی تدبیر نہ کرکے بھروسہ کرنا کہ یہ انشاء اللہ بھاگے گا نہیں صحیح نہیں، حضور (ﷺ) نے ایران میں منجنیق (جوتوپ کی طرح ہوتی تھی) بطور اسلحہ جنگ اختیار کیے جانے کو حضرت سلمان فارسیؓ سے سنا اور اختیار فرمایا۔ اسی طرح آپ (ﷺ) نے بادشاہوں سے رابطہ کرنے میں اس دور میں رائج طریقوں کو اپنایا، چنانچہ آپ (ﷺ) نے ان کے پاس خطوط روانہ کیے اور اس زمانہ کے مہذب ومثقف بادشاہوں کے رواج کے مطابق ان خطوط پر اپنی مہر لگائی، ساتھ ہی آپ نے لکھنے پڑھنے کو سیکھنے کا بھی حکم فرمایا بلکہ غیر عربی زبانوں کو بھی سیکھنے کا حکم دیا، آپ علم حاصل کرنے کا حکم فرماتے اور اس کی بہت تعریف کرتے تھے اور علوم کے جمع کرنے وترتیب دینے کا خاص اہتمام فرماتے تھے، آپ نے بعض صحابہ کو وحی الٰہی کو باقاعدہ قلم بند کرنے کے لیے منتخب فرمایا یہ چیز اس زمانہ میں رائج نہیں تھی اور بالکل نئی تھی اس لیے کفار مکہ نے قدرے تعجب سے اس کو دیکھا اور قرآن مجید میں ایسے لوگوں کا یہ قول نقل ہوا کہ یہ قرآن دراصل عہد ماضی کا افسانہ ہے اس کو انہوں نے یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھ لیا ہے، اور وہ صبح وشام ان کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔

آپ کا زہد وتوکل اس دور میں رائج وسائل کو اختیار کرنے میں حارج نہیں ہوا، آپ نے کھجور کی تلقیح کو دیکھا تو اس کو نہ کرنے کی بات فرمائی، اور اس سے لوگوں کو روک دیا، لیکن جب آپ (ﷺ) کو علم ہوا کہ ترکِ تلقیح سے پھلوں کو نقصان ہو رہا ہے تو انہیں اجازت دیدی اور فرمایا کہ یہ تمہارے دنیاوی معاملات میں سے ہے یعنی عام تدبیروں سے اس کا تعلق ہے جسے انسان اپنے تجربہ اور فہم کی بنیاد پر اپناتا ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دین اس سے روکتا نہیں ہے بلکہ اس کو بہ نظر تحسین دیکھتا ہے اور جب تک کوئی بات دین سے متعارض نہ ہو اس کی تحسین وستائش کرتا رہتا ہے۔

گویا اس کے ذریعہ آپ (ﷺ) نے ایک عظیم بنیاد قائم کی جس پر عام مسلمان کی زندگی استوار ہوسکے وہ یہ کہ جو چیز دین کے طے شدہ امر کے خلاف نہ ہوتی ہو اس کا تعلق صرف دنیاوی معاملات و تجربات سے ہو تو مؤمن جس پر اپنے رب کی اطاعت کے ساتھ ساتھ دین کے احکام کی پیروی لازم ہے اس کو اختیار کرسکتا ہے یعنی اقتصادی اور سیاسی، معاشرتی و ثقافتی اور اس سے متعلق امور میں بشرطیکہ دین کے بتائے ہوئے کسی امر کے خلاف نہ پڑتے ہوں اپنی زندگی کے فائدے کے لیے اس کو اپنانے میں وہ خود مختار و آزاد ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان چیزوں کی اجازت فرمائی اور ان میں سے متعدد کو خود اختیار فرمایا اور اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں اس سلسلہ میں ایسے نقوش چھوڑے جو قیامت تک تمام بنی نوع انسان کے لیے اسوہ اور نمونہ ثابت ہوں، جس سے مسلمان اپنی دنیاوی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی میں رہنمائی حاصل کرے، اور مسلمان ہر زمانہ اور ہر خطہ میں اپنی معاشرتی زندگی کی تشکیل میں اس کو نقش راہ بنائے، آپ (ﷺ) نے ان کو یہ اصول عطا کیا کہ وہ اپنے دینی امور میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول (ﷺ) سے مستنبط شرعی احکام کی پیروی کریں اور اس سے دینی زندگیوں کی تعمیر کریں اور عام معاملات میں جسے حضور (ﷺ) اور ان کے صحابہؓ نے اپنی مبارک زندگیوں میں بطور نمونہ چھوڑا ہے یا جن کو انسانی تجربہ اور انسانی فہم پر چھوڑا ہے اس کو اپنا کر دنیاوی زندگی میں رواں دواں ہوں۔

اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے میدان کار

اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لیے ہر زمان و مکان میں میدانِ کار کو تین دائروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ان میں سب سے مقدم گھریلو زندگی ہے، جس میں والدین اور گھر کے ذمہ دار افراد کا بہت اہم رول ہوتا ہے، اور ان سب میں سب سے زیادہ اولیت والدین کو حاصل ہے جو خاندان کے سربراہ ہوتے ہیں، اور گھر کی ذمہ داریوں کو سرانجام دیتے ہیں اس لیے کسی کی ذاتی شخصیت کی تعمیر گھر کے اندر اور انہیں دو بڑوں کی ذمہ داری میں ہوتی ہے، اور یہیں عقائد کی درستگی اور اخلاقی تربیت کا سامان مہیا ہوتا ہے۔

دوسرا دائرہ کار اسکول (تعلیم گاہ) ہے جس میں بچے کو گھریلو درستی کے بعد داخل کیا جاتا ہے، اور وہ وہاں سے زندگی سے متعلق علوم وفنون سے واقفیت اور خدا اور سول کے بتائے ہوئے اصولِ زندگی کے احکام حاصل کرتا ہے، اور صنعت وحرفت کی تربیت پاتا ہے، جو اس کی زندگی کا ایک حصہ ہیں، یہاں اس کی مکمل تربیت ہوتی ہے اور اس کی اپنی شخصیت کی عمارت کا آخری پتھر نصب کیا جاتا ہے، نیز آنے والی زندگی کے مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے وہاں اس کو غذا فراہم کی جاتی ہے۔

تیسرا دائرہ عمل معاشرتی ہے جس میں اسکول سے نکلنے کے بعد انسان پورے طور پر داخل ہوتا ہے، اور وہاں ثقافت ومعاشرت کے مسائل کا سامنا کرتا ہے، اور ان کا تجربہ کرتا ہے اور اس کے اندر اس کی شخصیت گھل مل جاتی ہے، وہاں اس کی حیثیت معاشرہ کی عمارت کے ایک پتھر کی ہو جاتی ہے۔

گھریلو تربیت

ان تینوں دائرہ کار میں سب سے زیادہ اہمیت کے لائق اور بچے پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز گھریلو زندگی کا دائرہ عمل ہے، جس میں والدین اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں، اور اس میں والدہ کا رول بہت ہی اہم، گہرا اور اثر انداز ہونے والا ہوتا ہے، اور اس مرحلہ میں بچہ ایک گندھی ہوئی مٹی کی طرح ہوتا ہے، جس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہت ہی سہولت اور مہارت کے ساتھ کسی بھی سانچے میں ڈھالنا ممکن ہوتا ہے، بالکل مٹی کے اس برتن کی طرح جسے کمہار گیلی مٹی سے بناتا ہے، حضورؐ نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے بچے کی دینی صورت حال کے سلسلے میں فرمایا کہ بچے اصل فطرت پر پیدا ہوتے ہیں (جو اسلامی مزاج کے مطابق ہوتے ہیں) پھر ان کے والدین اگر مجوسی ہوئے تو انہیں مجوسی بنادیتے ہیں، اور اگر یہودی ہوئے تو یہودی، اور نصرانی ہوئے تو نصرانی بنالیتے ہیں اس بنا پر احادیث میں بچے کی دینی تربیت کی جانب خاص طور سے توجہ دلائی گئی ہے، اور دین اسلام کا سب سے اہم اور واجب امر یعنی نماز کے سلسلے میں سات سال کی عمر ہو تو اسکو سمجھا کر اس کی ادائیگی کے

لیے اور دس سال گزرنے پر نہ کرے تو سختی اور سزا اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور یہ دیکھا گیا ہے کہ بچپن میں نماز کی ادائیگی کی عادت پڑ جائے تو زندگی بھر اس کی عادت رہتی ہے۔

بچپن کی زندگی

ایام طفولیت کی فطرت ونفسیات ایسی ہوتی ہے کہ گھریلو زندگی کے جملہ مراحل میں اس کے گرد وپیش رونما ہونے والے واقعات اور اس کے والدین اور خاندان کے اعمال وکردار اس کی زندگی پر بہت تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے ہر دیکھی اور سنی چیز کو سمجھنا چاہتا ہے اور جو بھی اسے نئی چیز نظر آتی ہے اور بھا جاتی ہے اس کو اس سے دلچسپی ہونے لگتی ہے وہ اس دنیا میں نیا نیا آتا ہے اور اگر دوپیش کے امور کو اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوتا ہے تو اسے یہ دنیا اپنے نئے نئے اور خوشنما مناظر اور حالات کی بنا پر پسند آتی ہے اور وہ اپنے والدین کے زیر تربیت ان کا مشاہدہ کرتا ہے اور ان سے باخبر ہوتا ہے، اور ان واقعات کے سلسلے میں والدین کی وضاحت کو قبول کرتا ہے اور ان تمام چیزوں کو قبول کرنے کے سلسلے میں اس کی مثال پہلے مشاہدہ اور تأثر کی ہوتی ہے، جو دل میں قائم ہونے کے بعد دل ودماغ پر نقش ہو جاتی ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے ۔

عرفت هواها قبل أن اعرف الهوى   فصادف قلبا خاليا فتمكنا

(اس کی چاہ میرے دل میں اس وقت آئی جب میں چاہ کے معاملہ سے واقف نہیں ہوا تھا، تو اس نے میرے دل میں یہ جگہ خالی پائی وہ اس میں بیٹھ گئی)۔

بالکل اسی طرح بچے کا خالی دل بھی اس مرحلے کے محسوسات کو قبول کر لیتا ہے، اسی کے ساتھ وہ اس طبیعت اور تأثر کو بھی قبول کر لیتا ہے جس کے ساتھ بچہ ان چیزوں کو دیکھتا ہے، ان میں سب سے مقدم اس کے والدین ہیں یہاں تک کہ جب بچہ اپنے والد کی طاقت کو پہلی بار محسوس کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ روئے زمین پر سب سے زیادہ طاقتور ہے اور جب اسے اپنی والدہ کے فہم وبصیرت کا علم ہوتا ہے تو وہ گمان کرتا ہے کہ وہی سب سے زیادہ عقل مند ہیں، اس لیے وہ ان کی بات سنتا اور مانتا ہے اور ان کے عقائد وتصورات کو قبول

کرتا ہے، اسی لیے والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کو انسانی طریقہ پر ڈھالیں اور اس کے ذہن ودماغ میں اسلامی عقیدہ کو جمائیں، اور اس کی تربیت سلوک وسیرت کے ٹھیک طریقہ پر کریں، اس لیے کہ والدین عقیدہ کے جس بیج کو اس کے ذہن ودماغ میں بوئیں گے بچہ ہمیشہ اپنی زندگی کے تمام مراحل میں ان کو اختیار کیے رہے گا اور بڑے مکروفریب اور کوششوں کے بعد ہی وہ ان سے روگردانی پر تیار ہو سکے گا، اس طرح بچے کی آنے والی زندگی میں صرف کی جانے والی کوششیں بچپن کے اثر کو زائل کرنے میں اور اس کی بنیادی تشکیل کے لیے مخالف اثر کو جاگزیں کرنے میں بہت مؤثر نہیں ہوتیں، اور عرب شاعر ابوتمام کا یہ شعر اس پر صادق آتا ہے ۔

نقل فؤادك حيث شئت من الهوىٰ　　فما الحب الا للحبيب الاول

(کہ تم اپنے دل کو جس کے بھی عشق ومحبت کی طرف لے جانا چاہو لے جاسکتے ہو، محبت تو پہلے والے محبوب سے ہی وابستہ رہے گی)۔

سمجھدار لوگ اور اہلِ بصیرت اپنے بچوں کی تربیت اور زندگی کے اس مرحلے میں ان کے اسلامی تشخص کی تشکیل کی جانب بطور خاص توجہ دیتے ہیں، اس لیے ان کے بچے اسی راہ پر چلتے ہیں، جن پر ان کے والدین چاہتے ہیں اِلَّا یہ کہ خود یہ اہل بصیرت ہی بچے کی نفسیات کے سمجھنے اور اس کے رجحان سے واقف ہونے میں خطا کریں، اس وقت ان کی کوشش رائیگاں جاتی ہے، جب وہ بچے کی ذہنیت کو سمجھنے میں غلطی کرنے کے ساتھ ہوتی ہے، جس سے ان کا فطری مزاج میل نہیں کھاتا، ایسی صورت میں خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا، بلکہ اس سے بچے کی فطرت مخالف ہوجاتی ہے، اور اس بنیاد پر اس کا ذہن سرکش ہوجاتا ہے، اور اگر اسے اس مرحلے میں اپنی مخالفت کے اظہار کا موقع نہیں مل پاتا تو وہ ان تمام یادوں کو مستقبل کے لیے محفوظ کرلیتا ہے اور جیسے ہی وہ والدین کے چنگل سے آزاد ہوتا ہے، اپنے والدین کے بتائے ہوئے طریقے سے پھر جاتا ہے اور وہ ان تمام امور کے خلاف کام کرنے لگتا ہے، جن کی اسے بچپن کی تربیت میں تلقین کی گئی تھی، اس لیے بچے کی سادہ ،ذہنیت اور اس کی چھوٹی سی عقل کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے، جس کے لیے دقیق معانی

اور مبہم مفہوم کا ادراک مشکل ہوتا ہے، اس وقت اس کے لیے محض نرمی ہی معاون ہوتی ہے اور جب نرمی سے کام نہ چلے تو تھوڑی سی سختی بھی مفید ہوتی ہے بقول ایک شاعر جو مربی کے لیے مناسب اصول کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''اس نے سختی کی تا کہ ان کو تنبیہ ہو اور یہ عقل کی بات ہے کہ آدمی جن کے ساتھ ہمیشہ نرمی و محبت برتتا ہے، کبھی کبھی سختی بھی کر لیا کرے''۔

بچے کی تربیت میں ماں کا حصہ

بچے کی تربیت کے سلسلے میں ماں کو سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے، وہ بچے کی ایسی اخلاقی تربیت کرسکتی ہے جو زندگی بھر باقی رہے، اور ماں ہی بچے سے نرمی سے پیش آنے اور اس سے محبت کرنے میں دوسروں پر فائق ہے، وہی اس کے آرام وراحت اور خواہشات کا سب سے زیادہ اہتمام کرتی ہے، بھلا اس سے بڑھ کر بچے سے کون محبت کرسکتا ہے، جو اس کی ہر صدا پر ہمہ وقت لبیک کہے اور اس کے ہر ناز ونخرے کو بسروچشم قبول کرے، کتابوں میں بعض اہم شخصیات نے جب اپنی شخصیت سازی میں اہم کرداروں اور عوام کا ذکر کیا تو اس میں بچپن میں اپنی ماں سے جو کچھ انھوں نے حاصل کیا تھا اس کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے، کیونکہ ان کا تأثر سب سے زیادہ اپنی ماؤں سے ہوا، انہیں میں سے ایک یہ حکایت بھی ہے کہ ایک نوجوان کو اس کے شر وفساد کے نتیجہ میں پھانسی کا حکم صادر کیا گیا تو اس نے پھانسی سے قبل ایک بار اپنی ماں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، جب وہ ملاقات کے لیے آئی تو اس نے اس کے کان کو دانت سے بری طرح کاٹ لیا اور اس نے کہا کہ یہ بچپن میں میرے جرائم سے درگزر کرنے کی سزا ہے، جو یہ میری بے راہ روی کو سن کر کرتی تھیں، چنانچہ اس بات نے آج مجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

معاشرہ کی تہذیب وثقافت کی حفاظت میں بھی ماں کا بہت اہم کردار ہوتا ہے، وہ اس گھر کی مالکہ ہوتی ہے جس میں وہ نقل پروان چڑھتی ہے، پھر اس کو مستقبل میں زندگی کے مسائل سے دوچار ہونا ہوتا ہے ان میں اسی رول کے تأثرات سے روشنی ملتی ہے، ہندوستان میں ہندوؤں کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ آٹھ سو سالہ اسلامی دور حکمرانی میں ان کے گھر و

ں میں ماؤں نے اپنی ہندی زبان کی حفاظت کی، اور وہ اسی میں لکھتی پڑھتی رہیں، اور جب ہندوؤں کو اقتدار ملا تو ان کی زبان زندگی کے مختلف میدانوں میں بآسانی رائج زبان بن گئی۔

اسلامی تاریخ میں مسلمان ماؤں نے روشن کارنامے انجام دیئے ہیں، جب ہم اہم اسلامی شخصیات پر غور کرتے ہیں تو ہم ان میں سے اکثر کی ماؤں کو عزم وہمت کی بلند چوٹی پر پاتے ہیں، اور بہت سی عظیم شخصیتوں نے ان کا باقاعدہ تذکرہ وستائش بھی کی ہے۔

بچے کا فطری رجحان

بچوں کو وہ کہانیاں بہت پسند ہوتی ہیں جو عجیب وغریب باتوں اور واقعات پر مشتمل ہوں وہ ان کو سننے کے مشتاق و بے چین رہتے ہیں، چنانچہ ذہین والدین بچوں کے دینی عقیدہ کی تعمیر اور اخلاق ومعاشرتی تصورات کی تشکیل کے لیے ان کی اس رغبت اور خواہش سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں، اس سلسلے میں نبیوں، مجاہدوں اور غازیوں، فاتحین اور اولیاء وصالحین کے قصے خاص طور پر مفید ثابت ہوتے ہیں، اور کہانیوں میں اصلاحی پہلوؤں کو اجاگر کرنا بہت اچھا ہوتا ہے، جن گھروں میں سونے سے قبل بچوں کو ان کے شوق کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں وہاں اس اصلاحی پہلو کا خیال رکھنا بہت بہتر ہوت ہے، اسی طرح بچوں کو قرآن کریم کی آیتوں کی تعلیم دینا اور ان کے خالی اوقات میں ان کو کچھ مختصر دعائیں یاد کرانا اور پھر ان کا تکرار واعادہ اور ان سے سوال وجواب بھی فائدہ بخش ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ والدین کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے سامنے وہ کوئی ایسی بات نہ کریں جو انہیں اچھے اخلاق سے دور کردے، اور جو حیا کے منافی اور عزت وشرافت سے الگ ہو، اسی طرح وہ شوخی ومذاق بھی ہے، جو والدین کے درمیان بحیثیت زوجین کے مباح ہے، اس لیے کہ بچے کی کم فہمی حقیقت کے دبیز پردوں کو چاک نہیں کرپاتی اس لیے وہ مذاق کرنے والے کا من وعن وہی مفہوم لیتا ہے جسے وہ سنتا یا دیکھتا ہے، بلکہ والدین کو معلوم ہونا چاہئے کہ بچے کی سمجھ ایک جذب کرنے والے اس کاغذ کی طرح ہوتی ہے، جو تر روشنائی کو جذب کرلیتا ہے، بچے بھی اپنے والدین کی جانب سے صادر ہونے والے ہر قول وفعل کو خواہ وہ

اچھے ہوں یا برے ہر حال میں قبول کر لیتے ہیں۔

والدین کو چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کو آزاد نہ چھوڑیں کہ وہ دوسروں کی فحش گوئی کم عقلی یا ان کے برے حالات سے باخبر ہو سکیں، یا پھر والدین اس کی وضاحت کر دیں کہ یہ ایسے لوگ نہیں ہیں جن کو نمونہ بنایا جائے، اور نہ ہی اس لائق ہیں کہ ان کی جانب تقلید کی نیت سے دیکھا جائے، اور یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جب والدین اپنے بچوں کی بہتر طریقہ پر روش کرنا چاہتے ہوں اور اس کا پورا اہتمام اور رعایت کرتے ہوں اور جب کسی غیر کی تقلید کرتے ہوئے بچہ سے کوئی برا کام سرزد ہو یا کسی نامناسب عادت کا ظہور ہو مثلاً دروغ گوئی اور گھٹیا بات یا چوری یا کوئی بری حرکت تو والدین کی طرف سے فوراً بچوں کو تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے، اور شریفانہ طور پر وطریق اور حیا کی حفاظت کے لیے بری چیزوں سے اجتناب کے پہلوؤں کو واضح کرنا بھی ضروری ہے، اس سے باز رکھنے کے لیے والدین کو چاہئے کہ وہ بچوں کے سامنے سلف صالحین کے مثالی واقعات پیش کریں۔

بچے کی پرورش کے لیے اصلاحی وسائل

وہ امور جن وسائل پر متنبہ ہونا ضروری ہے، ان میں موجودہ تہذیب ہے جو مختلف معاشروں پر مسلط ہے اور اس کے متبعین زندگی کے مختلف مسائل سے دوچار ہیں، اس کی وجہ سے والدین کے پاس اتنا موقع نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچے کی پرورش کر سکیں کیونکہ وہ سروس پیشہ ہیں، اور دولت کے حصول کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں، اور اس کے لیے بہت جلد گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوتے ہیں اس بنا پر اکثر والدین اپنے بچوں کو تربیت گاہوں یا بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر دیتے ہیں اس لیے ایسی صورت حال میں ان کو چاہئے کہ وہ بہترین تربیت گاہوں کا انتخاب کریں اور عقائد کی صحت اور استقامت کی زندگی کو اپنانے کا پورا خیال رکھیں، اسی طرح وہ اچھی بورڈنگوں کو ترجیح دیں جن میں ان کے رجحانات ٹھیک ہوں اور ان کے ذمہ داروں کے عقائد صحیح ہوں اور وہ لوگ اچھی سیرت واخلاق کے حامل ہوں۔

تعلیم گاہ کا میدان کار

تعلیم گاہ کے معاملات کے سلسلہ میں اصل ذمہ داری تعلیمی اداروں کے ماہرین تعلیم کی ہوتی ہے، اس سلسلہ میں طلباء کے سرپرستوں کے کرنے کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ درسگاہوں کے معاملہ میں بہتر سے بہتر انتخاب سے کام لیں، اور اپنے بچوں کو وہاں داخل کریں، اس طریقہ سے تعلیم کی جو اہمیت ہے اس کے مطابق عملدرآمد کی صورت بنتی ہے، اور یہ بات کسی بھی دانش مند سے پوشیدہ نہیں کہ معاشرہ کی تشکیل میں باقاعدہ تعلیمی نظام کا کتنا بڑا حصہ ہوا کرتا ہے؟ اور صالح نسلوں کی تیاری میں اس کا کیا کردار ہوتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ بعض اہل علم نے اور تعلیمی اصول مرتب کرنے والے افراد نے بہت سے ملکوں کے اندر لوگوں کے فکری رجحانات کو بدلنے اور ان کے افکار و خیالات کو نیا رنگ دینے میں اس وقت سرخروئی حاصل کی جب انہوں نے اس مقصد کے لیے تعلیم کا سہارا لیا، اور اس کو وسیلہ بنایا ان لوگوں کی کوششوں کو اس وقت بہت طاقت مل جاتی ہے اور ان کا اثر بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے جب ان کو حکومتوں کی بھی سرپرستی مل جاتی ہے اور وہ تعلیم کو اپنے دل پسند مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں ان پر ظلم و زبردستی کرنے کا الزام بھی نہیں لگتا اور مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ اکبر مرحوم نے کہا تھا ۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

تعلیمی عمل کی تین بنیادیں

باقاعدہ تعلیمی عمل تین بنیادوں یعنی طالب علم، معلم اور نصاب تعلیم پر قائم ہوتا ہے جب ان میں سے کوئی بھی ناقص اور نامکمل ہوگا تو مقصد کے حصول میں پوری کامیابی نہ ہو سکے گی، اس لیے ایک بہتر معاشرہ کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ان تینوں بنیادی چیزوں کی درستگی کا اہتمام کیا جائے۔

(الف) جہاں تک طالب علم کا تعلق ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اوائل

عمر کے مزاج اور فطری کیفیت کا خیال رکھا جائے یعنی اس مرحلہ میں ہر نئی بات کو قبول کر لینے کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کو پیش نظر رکھا جائے، اس کی عمر کے اس ابتدائی مرحلہ میں اس کا ذہن ہر چیز کو قبول کرنے کا عادی ہوتا ہے اور نئی بات اس کے ذہن میں پوری طرح بیٹھ جاتی ہے۔

(ب) جہاں تک مدرس کا معاملہ ہے تو اس کا مرتبہ ایک طالب علم کی نظر میں اس کے والد کے مرتبہ سے ملتا جلتا ہوتا ہے، وہ اپنے استاد کا احترام اور اس کی قدر کرتا ہے اور اسے آئیڈیل اور لائق تقلید تصور کرتا ہے، سوائے کسی ایسی بات کے جو بالکل اسی کی طبیعت کے خلاف ہو اور اس کے دل میں بیزاری پیدا کرنے والی ہو اس کے علاوہ میں وہ اپنے استاد کی نقل کرتا ہے اور ان کے افکار و خیالات کو قبول کرتا ہے اس لیے استاد کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اچھے اخلاق اور سیرت سے آراستہ رکھے اور خاص طور سے طلبہ کے سامنے معیاری زندگی اختیار کرنے کی کوشش رکھے، اور اس میں طالب علم کو سکھانے اور اچھا بنانے کا جذبہ ہو اور اس کا لحاظ ہو کہ طالب علم اس کی کسی کمزوری یا بے احتیاطی کی وجہ سے اچھی اور مفید بات سیکھنے سے محروم نہ رہ جائے۔

(ج) جہاں تک نصاب تعلیم کا مسئلہ ہے تو وہ طالب علم کے لیے غذائی نظام کی حیثیت رکھتا ہے، بالخصوص زبان و ادب اور سماجی علوم میں تو خاص اہتمام کی ضرورت ہے، بہر حال نصاب تعلیم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اخلاقی بگاڑ اور گمراہیوں کے اثر سے پاک وصاف تیار کیا جائے، اور صالح اسلامی معاشرہ کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے مطابق نظام تعلیم مرتب کیا جائے جو اپنے پڑھنے والوں اور ان کے سرپرستوں کے تصور وعقیدہ سے نیز ان کے اس معاشرہ کے مطمح نظر اور قدروں سے ہم آہنگ ہو جس میں طالب علم سانس لیتا اور اپنے شب و روز گزارتا ہے۔

بچے کی فطرت اور صلاحیتوں کا لحاظ

یورپ میں تعلیمی میدان میں کی گئی کوششوں کے اثر سے متعدد نئے فکری رجحانات پیدا ہوئے جن کو دنیا کے مختلف تعلیمی نظاموں میں اپنایا گیا ان میں سے بیشتر میں کم سن طالب

علموں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے، ان نظاموں میں کم سن طالب علموں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے، ان نظاموں میں کم سن طالب علم کو تعلیمی لحاظ سے خاصی اہمیت دی گئی ہے اس کے ساتھ زائد آزادی کا معاملہ کیا جاتا ہے، اور اس کے ذہن اور اس کی دلچسپی کا پورا خیال رکھا جاتا ہے، اس سلسلہ میں مانٹیسری نظام تعلیم خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس کے نہج پر بہت سے اسکول قائم ہیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اگر یہ نظریہ اعتدال کے ساتھ اپنایا جائے اور اس میں شدت اور غلو سے کام نہ لیا جائے تو یہ بڑی حد تک فطری خصوصیات سے زیادہ ہم آہنگ اور زیادہ سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔

اکثر تعلیمی نقطہائے نظر جو اس دور میں یورپ میں مرتب ہوئے، اور مشرق میں بھی جنہوں نے اپنی افادیت کا سکہ جمایا ان میں سب نے آزادئ خیال کو اپنے تعلیمی نظریہ کی بنیاد بتایا ہے، اس میں سے بیشتر نے مذہب کی بالادستی اور زندگی کے میدان میں اس کی رہنمائی کو مسترد کیا ہے وہ انسان کے لیے اخلاقیات کی پابندی کو بھی قبول نہیں کرتے بلکہ ان کو آزاد چھوڑ دینا چاہتے ہیں لیکن مسلمان طالب علم کا معاملہ مختلف ہے اس کے لیے مقصد اور طریقۂ کار دونوں ہی نیک اور مفید ہونا ضروری ہیں، اور اس کو اخلاقیات کا بھی پابند ہونا ہے۔

نصاب تعلیم کی قسمیں

مسلمانوں کا نصاب تعلیم تین قسم کے موضوعات پر تقسیم ہوگا، ان میں سے ایک قسم طبیعیاتی اور ان سے متعلقہ علوم کی ہے، دوسری قسم زبان وادب اور سماجی علوم کی ہے، تیسری اخلاقی ومذہبی علوم کی ہے، جو بھی نصاب بنایا جائے گا اس میں ان تینوں قسموں کے علوم کو اختیار کرنے کا سوال آئے گا، انسانی زندگی کی تشکیل میں یہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر اثر ڈالتے اور کام کرتے ہیں، ان میں سے آخری قسم ایسے علوم کی ہے جو انسانی رجحانات اور اخلاق کی پاکیزگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یورپ کے اختیار کردہ طریقہائے تعلیم میں ان کو جگہ نہیں دی جاتی اور ان کو ضروری نہیں سمجھا جاتا، چنانچہ پہلی دو قسمیں یعنی طبیعیاتی علوم اور زبان وادب وسماجیات ہی مغربی تعلیم کے نظاموں میں داخل رکھی گئی ہیں، ان دو میں سے اوّل الذکر قسم

ذہن کو غلط رخ پر نہیں لے جاتی لیکن دوسری قسم یعنی زبان وادب وسماجیات کو انسانی ذہن میں نئے اور مختلف خیالات داخل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے چنانچہ مغربی نظام تعلیم نے اسی کے ذریعہ اثر ڈالا اور ذہنوں کو متاثر کیا ہے، مسلمانوں کے نظام تعلیم میں اس قسم کو صحیح مقصد کے لیے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

نصاب تعلیم کی ترتیب

مشرقی ممالک میں اختیار کردہ نظامہائے تعلیم کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ یورپ کے تسلط سے قبل ان مشرقی ملکوں میں رائج نظام تعلیم صرف ایک تھا اور اس میں دین ودنیا دونوں کے تقاضوں کی رعایت ہوتی تھی جو طالب علم کے لیے وہی اس کے پیش نظر مقاصد کے لحاظ سے دین یا دنیا کے حصول کا ذریعہ ہوا کرتا تھا اور اس سے ایسے اہل علم تیار ہوتے تھے جو اپنے اپنے رجحان زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق ہو سکیں، لیکن مغربی سامراج نے مذہبی اور اخلاقی پہلو کو نظر انداز کر کے تعلیم کا مقصد محض دنیاوی جاہ وعزت بنالیا، اور اخلاقی ومذہبی مقصد کے لیے اس نظام کے اندر کوئی گنجائش نہیں رکھی، چنانچہ مذہبی اقدار کی اہمیت کو تسلیم کرنے والوں نے دین کی حفاظت کے لیے تعلیم کے ذریعہ کو علاحدہ سے اختیار کیا اور تعلیم میں صرف دینی علوم کو جگہ دی، اس سے متعلق مضامین کا مصان بنایا اور اسی کے ساتھ مذہب کو نظر انداز کرنے بلکہ اسلام مخالف نقطۂ نظر کو اپنانے والے نظام تعلیم کو یکسر مسترد کر دیا، اور اپنے اختیار کردہ خالص مذہبی نصاب تعلیم کو چلانے پر متعدد علماء نے اپنی توانائیاں صرف کر دیں، اس کے نتیجہ میں تعلیم دو نظاموں میں بٹ گئی، اس ٹکراؤ کے سبب دونوں میں تعاون کی صورت نہ ہونے کی وجہ سے ملت اسلامیہ کے اپنے مقاصد کی تکمیل کرنے والا تعلیمی نظام نہ بن سکا، ملت کی ضرورت دراصل ایسے نصاب تعلیم کی تھی جس میں تعلیم کے تینوں پہلوؤں کی رعایت ہو اور تینوں کے مبادی کے حصول کے نظم کے بعد تینوں میں سے کسی ایک یا کسی دو کے اختصاص کے حاصل کرنے کا انتظام کیا جائے اور یہ کام قدیم علوم کے صحیح حصہ کو اور جدید علوم کے ضروری اور مفید حصہ کو ایک ساتھ جمع کر کے کیا جا سکتا تھا، یہ

ملت اسلامیہ کی ایک ضرورت ہے، کہ دین کو پختہ طریقہ سے باقی رکھتے ہوئے دنیاوی علوم کے میدان میں بھی حصہ رہے، ہندوستان میں اس تعلیمی نقطۂ نظر کو اپنانے اور اسکے مطابق نظام مقرر کرنے کا آغاز ندوۃ العلماء سے وابستہ افراد نے گذشتہ دہائیوں سے کیا ہے، جن کی اس فکر ونہج کے بارے میں مستقل تصنیفات اور آراء ہیں، اور وہ اس موضوع پر بڑی اہمیت کے حامل ہیں انہوں نے نصاب تعلیم میں سماجیات اور زبان وادب کے نافع علوم کو شامل کر کے بعض اچھے تجربات حاصل کیے، اس سلسلہ میں ندوۃ العلماء کا تخیل اور تجربہ اہمیت رکھتا ہے۔

الغرض معاشرہ کی اصلاح وتربیت کے میدان میں تعلیمی نظام کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے اندر اسلامی معاشرہ کی بہتر اور متوازن زندگی کے تمام پہلوؤں کی رعایت کی جائے۔

ذرائع ابلاغ کا کردار

اس وقت علوم وفنون کے علاوہ بعض دیگر ایسے ذرائع بھی وجود میں آچکے ہیں جو تربیتی مقصد کے حاصل کرانے میں بڑے کارگر ثابت ہورہے ہیں ان میں سب سے مقدم اور سب سے اہم اس وقت ذرائع ابلاغ ہیں ان میں سے صحافت اس وقت ایک مستقل بالذات اور آزاد روش کی ایک تعلیم گاہ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے، ذہنوں کو غذا فراہم کرنے اور لوگوں کے رجحانات واحساسات کو اپنے مقصد کے سانچے میں ڈھالنے میں صحافت کا کردار بڑا اہم بن گیا ہے، بعض مرتبہ تو اس کے اثرات اتنے ہمہ گیر ہوتے ہیں کہ ذرائع ابلاغ تعلیمی وتربیتی مرکزوں سے بھی کہیں آگے بڑھ جاتے ہیں اور یہ اثرات معاشرہ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اب صورت حال یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ ذرائع ابلاغ کے حلقۂ اثر سے زندگی کے تمام حلقے متأثر ہورہے ہیں ان کا عمل دخل گھروں، چائے خانوں اور تعلیمی اداروں اور فکروادب کے مرکزوں میں صرف ہوا ہی نہیں بلکہ بڑھتا جارہا ہے، ترقی یافتہ ملکوں میں تو اس نے ذہنی غذا کی صورت اختیار کر لی ہے، اخبار بینوں کو یہ غذا صبح ناشتہ کے وقت ہی مل جاتی ہے اور اس سے وہ ہر روز تہذیبی وعلمی خوراک حاصل کرتے ہیں اور یہ بھی غذا صرف ایک

ہی دن نہیں کئی کئی روز کے لیے کافی ہوا کرتی ہے اور اس دور میں تو صحافت نے اس قدر ترقی کر لی ہے اور اس کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ سوسائٹی کی تعمیر اور اس کو اپنے منصوبہ کے مطابق ڈھالنے میں بہت زیادہ اثر انداز ہو رہی ہے، اس کے ذریعہ جہاں کسی قوم کی عزت ونا موری پر چار چاند لگائے جاسکتے ہیں تو وہیں کسی کی عزت وناموس کوز میں بوس بھی کیا جاسکتا ہے اگر وہ کسی پارٹی کی پشت پناہی کرتی ہے تو اسے لوگوں کے دلوں میں سر بلند و باعظمت بنا دیتی ہے اور کسی پارٹی کے پیچھے پڑ جاتی ہے تو اس کی شان وشوکت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں صحافت ایک ایسا پُرتأثیر ذریعہ بن چکا ہے کہ وہ جب چاہے زندگی کے کسی بھی پہلو کے اثرات کو ابھار دے اور جب چاہے کسی بھی پہلو کو گرا دے، اور ملک سے اس کے اثرات کو ختم کر دے، اس کی اسی اثر انگیزی کی وجہ سے ارباب سیاست اسی کی پناہ ڈھونڈھتے ہیں اور تجارت پیشہ افراد اس کے ذریعہ اپنے کاروبار کو فروغ دیتے ہیں اور فکر وثقافت کے حاملین اپنے مقاصد میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ جس طرح بھی چاہتے ہیں لوگوں کے سامنے اپنے حالات پیش کرتے ہیں، چنانچہ لوگوں کے سامنے صرف وہی باتیں آپاتی ہیں جن کو اہل صحافت ان کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، اور وہ جس چیز کو عوام کی نگاہوں سے اوجھل رکھنا چاہتے ہیں عوام اس سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔

حکومتیں بھی ملک میں اپنے اقتدار کی برقراری کے لیے صحافت کا سہارا لیتی ہیں بلکہ ان کو اپنی تائید وتعاون پر آمادہ یا مجبور کر لیتی ہیں، اس صورت میں صحافت کا ادارہ حکومت کے مقاصد کے مطابق کام کرتا ہے اور بعض مرتبہ تو صحافت برسر اقتدار پارٹی کے حق میں عوام کی آراء اور ان کے خیالات کو تبدیل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوتی ہے اور حکومت اور حکمراں پارٹیاں اس کے ذریعہ لوگوں کے افکار وخیالات کو بدلنے میں بہت جلد کامیاب ہو جاتی ہیں جب وہ کسی معاشرہ کو ٹھیک اور صالح بنانا چاہتی ہیں تو صحافت کے راستہ سے اپنے اس منصوبہ پر آسانی کے ساتھ عمل پیرا ہو سکتی ہیں اور ایک صالح اور مثالی معاشرہ کی تشکیل پر قادر ہو سکتی ہیں۔

مسلم حکومتیں بھی صحافت کے ذریعہ اپنے ملک کے اندر آباد معاشرہ کو ایک ایسے اسلامی رنگ میں ڈھال سکتی ہیں جو اسلامی شریعت کے دو عظیم سرچشموں یعنی کتاب وسنت سے ماخوذ ہو۔

معاشرہ کو اسلامی رنگ دینا کوئی منفی رجعت پسندانہ کام نہیں ہے جس کا کہ اسلام مخالف عناصر مسلمانو پر الزام لگاتے ہیں دراصل وہ اسلامی احکام پر عمل کرنے اور اپنے اخلاق وکردار کو سنوارنے کی دعوت دینا ہے، اور اسلامی قوانین پر عمل پیرا ہونا معاشرہ کو انسانی اور اخلاقی پہلوؤں کا کاربند بنانا ہے وہ ایک تعمیری اور اصلاحی کام ہے جس سے معاشرہ کے تمام افراد کو سکون اور عزت مل سکتی ہے، ان کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ایک نفیس اور نمائندہ تہذیب وتمدن وجود پاسکے، اور یہ چیز ملک اور عوام دونوں کے حق میں مفید ہے اس کے ذریعہ مسلمان دین اور دنیا دونوں کی کامیابی حاصل کرسکتا ہے اور غیر مسلم اس سے اپنی دنیا سنوار سکتا ہے جس کا وہ متمنی اور خواہش مند ہوتا ہے۔

ذرائع ابلاغ میں اب محض صحافت ہی تنہا مؤثر ذریعہ نہیں رہی بلکہ اس کے مماثل کئی دیگر ذرائع بھی میدان عمل میں بھرپور طریقے سے آچکے ہیں مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ ان دونوں کا لوگوں کے خیالات ورجحانات پر بڑا اثر پڑ رہا ہے اور یہ صحافت سے کم اثر انداز نہیں بلکہ اب یہ اس سے کہیں زیادہ مؤثر ہو رہے ہیں، جس سے چٹانوں جیسے احساسات وتصورات میں بھی لرزہ آجاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرے رجحانات وتصورات اپنا مقام بنالیتے ہیں۔

ان کے پہلو بہ پہلو ویڈیو کا عمل اور اس سے آگے کی چیز اپنے اختیار اور پسند میں ہونے کی وجہ سے زیادہ وسعت سے استعمال میں آسکتا ہے اس میں لوگ اپنے اختیار اور پسند کے پروگرام دیکھنے پر قادر ہوتے ہیں ایسے پروگرام جو جائز وناجائز تفریح پر مشتمل ہوتے ہیں، جن کے اندر اخلاق سوز ثقافت اور گمراہ کن تصورات اور پراگندہ خیالات کا پورا سامان ہوتا ہے، یہ ذہنوں کو مسموم کرتے ہیں جذبات میں تغیر پیدا کرتے ہیں۔ اس کے پروگراموں میں سے آزاد پروگراموں کی نقصان رسانی تمام اہل فکر ودانش کے سامنے آچکی ہے، وہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ صرف دینی اور اخلاقی تصورات واحساسات پر ہی اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ یہ لوگوں کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں ایک تو ٹیلی ویژن کو دیکھنے والے نوجوان اور بوڑھے اس کے پروگرام دیکھنے میں اس قدر منہمک ہوجاتے ہیں کہ وہ اپنی اہم مصروفیات اور ذمہ داریوں سے بھی غافل ہوجاتے ہیں، طالب علم اپنے سبق کی تیاری سے

غافل ہو جاتے ہے اور گھر کا ذمہ دار اپنے گھر کے کام کاج اور فرائض سے کوتاہی برتنے لگتا ہے تو اس سے اگر ایک طرف کچھ فائدہ محسوس کیا جاتا ہے تو دوسری طرف خاصا وقت کا وقت اور ضروری کاموں کی انجام دہی میں خلل پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ ان پروگراموں کے اندر اخلاق کو فاسد کرنے، اقدار و روایات کو پامال کرنے اور عزت و شرافت کو داغدار کرنے نیز خیالات و تصورات کو پراگندہ کرنے کی پوری تاثیر پائی جاتی ہے، افسوسناک بات یہ ہے کہ حکومتیں بھی ان خطرات سے مقابلہ کے لیے کوتاہی سے کام لے رہی ہیں جب کہ وہ بہتر طور پر ان پروگراموں کو منظم کر سکتی ہیں اور اس پورے نظام کے اصول و ضوابط مقرر کر سکتی ہیں اگر وہ چاہیں تو اس کے ذریعہ سوسائٹی کی بہتر طور پر تعمیر کے لیے اس کو ایک وسیلہ بنا سکتی ہیں جو یقیناً تعمیر و اصلاح اور ہدایت کا بہت ہی مؤثر اور طاقتور ذریعہ ہے۔

اکیڈمیاں، اشاعتی ادارے اور مسجدیں

اسلامی سوسائٹی کی بحسن وخوبی تشکیل اور اس کی علمی و ادبی تربیت کے لیے علمی ادبی اکیڈمیاں اور اشاعتی ادارے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور سوسائٹی کی تعمیر میں ان کا ایک اور اہم اور طاقت ور رول ہوتا ہے، یہ اپنی مطبوعات اور کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ اس کام کو انجام دیتے ہیں، خاص طور سے ان کے اثرات کی ہمہ گیری ادبی اور علمی مطبوعات میں ہوتی ہے جو صحافت کے اثرات سے ملتا جلتا کام ہے، ان اکیڈمیوں اور اداروں کی کتابیں پریس سے نکل کر لوگوں میں پھیلتی ہیں اور ان کی عام اشاعت ہوتی ہے وہ اپنے اسلوب بیان و زبان کے اثر سے لوگوں میں مقبول ہوتی ہیں اور ان کے ذریعہ لوگوں کے خیالات کو بدلنے اور دوسرے متعین کردہ مقصد کے مطابق ان کے ذہن کو ڈھالنے میں بڑی مؤثر ہوتی ہیں۔

اسی طرح لائبریریاں بھی اپنا کام انجام دیتی ہیں اور محققین اور اسکالرز اس میں اپنا مقصود اور مطلوب پاتے ہیں اور وہ ان سے ربط و وابستگی اختیار کرتے ہیں اور وہاں کے لٹریچر سے انہی کے خیالات و افکار سے اپنے ذہنوں کو بھرتے ہیں۔

ان تمام چیزوں کے دوش بدوش مسلمان معاشرہ کے لیے سب سے زیادہ باثر مسجدوں اور دینی جلسوں کا کردار ہے ان میں مخصوص طریق کار کے مطابق لوگوں کی دینی وفکری تربیت کی جاتی ہے اورعوام کی ایک بڑی تعداد کوضروری اسلامی ثقافت سے نہ صرف آشنا کرایا جاتا ہے بلکہ اس پر زندگی گزارنے کی تربیت کی جاتی ہے اورانہیں دینی افکار فراہم کیے جاتے ہیں اوران کے مؤمن قائدین کے درمیان تعلقات کواستوار کیا جاتا ہے جولوگوں کے لیے اپنے مناسب اورموزوں طریقوں کواپناتے ہیں۔

مسلمان قائدین کے کرنے کا کام

موجودہ دور میں اسلامی معاشرہ پراثر ڈالنے والے یہ متعدد ذرائع واسباب ہیں ان کو جس طرح مخالفین اسلام مسلم معاشرہ کو بگاڑنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں ہمارے مسلم اہل دانش مسلم معاشرہ کی صحیح تعمیر کے لیے کر سکتے ہیں مسلمان قائدین اور اسلامی فکر کے علمبرداروں کے لیے یہ کچھ مشکل بات نہیں کہ وہ معاشرہ کو متاثر کرنے کے یہ ذرائع اوراثر ڈالنے والے یہ طریقے استعمال کر کے حکمت ودانائی کے ساتھ اسلامی معاشرہ کودرپیش خطرات کا مقابلہ کریں، اوران وسائل کے رخ کوتخریب سے اسلامی معاشرہ کی تعمیر کی طرف موڑ دیں لیکن ان وسائل کا کامل طور پر استعمال صرف ان ملکوں کے لوگوں کے لیے آسان ہے جن ملکوں میں حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے اور جہاں مسلم حکومت نہیں ہے وہاں اس کام کی ذمہ داری اسلامی قیادت اوران افراد پر عائد ہوتی ہے جوامت اسلامیہ کی خدمت کے لیے پیش پیش ہیں اورامت کی اصلاح کی طرف ان کوتوجہ ہے اوروہ ایک عمدہ اسلامی سوسائٹی کے قیام کا اپنے سینوں میں عزم رکھتے ہیں۔

مخالف اثرات۔علاج اور جواب کی ضرورت

وقت کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ اسلامی بیداری کی جوفضا عالم اسلام کے مختلف ملکوں میں اس وقت قائم ہورہی ہے اوراس کواستعماری طاقتیں روکنے کے لیے طرح طرح کے مکر سے جوکام لے رہی ہیں اس کے مقابلہ پر خصوصی توجہ دی جائے، کیونکہ یہ استعماری

طاقتیں یہودی ذہنیت اور عیسائی مشنری جذبہ کے ساتھ مسلم معاشرہ کو اپنی عظیم ڈگر سے ہٹانے، اسلامی تشخص کی شکلوں کو بگاڑنے اور صحیح اسلامی خیالات کی جگہ اسلام مخالف تصورات وافکار کو جگہ دینے کی تدابیر اور سازشوں سے کام لے رہی ہیں اور جگہ جگہ خاصی حد تک اپنی ان کوششوں میں کامیاب بھی ہوئی ہیں، انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس وقت امت مسلمہ کئی جگہوں پر ٹکڑوں میں بٹ چکی ہے، اور ان میں رقابت اور باہم تفرقہ اندازی نے گھر کرلیا ہے اس پر مستزاد یہ ہے کہ اس کے اندر مختلف مذاہب اور نظریات نے جنم لے لیا ہے، ان کی اس اسلامی فکر کو بدلنے اور ان کو اپنے خالص عقائد سے موڑنے میں تعلیمی اور ابلاغی ذرائع اور علمی وصحافتی وسائل اور مغربی تمدن کی موجودہ ظاہری چمک دمک رکھنے والی تہذیب وثقافت نے بڑی حد تک متاثر کیا ہے اور ان ممالک میں ایک عرصہ سے استعماری حکومتیں رہنے کے نتیجہ میں مسلمانوں کی تہذیب وثقافت پر مستقل سوالیہ نشان بن گیا ہے۔

مغربی نظام تعلیم

ان تمام اثر انگیزیوں میں سب سے زیادہ خطرناک مغربی نظام تعلیم وتربیت ہے جس کے تحت ایک مسلمان طالب علم غیر مسلم معلموں اور معلمات سے یا پھر ایسے مسلمانوں سے تعلیم حاصل کرتا ہے جو اسلام دشمنوں کی گود کے پروردہ ہیں، یا پھر وہ اسلام مخالف عناصر مثلاً مستشرقین یا مشن سے تعلق رکھنے والوں کی تربیت اور ماحول کی وجہ سے مذہب کو ناپسند کرتے ہیں ایک مسلمان طالب علم کا ایسے ہی افراد سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ اپنی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے دوران ایسے ہی افراد سے فائدہ اٹھاتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کے عقائد کے اندر بہت ہی زیرکی اور ہوشیاری کے ساتھ شکوک وشبہات پیدا کردیئے جاتے ہیں۔

اس بنا پر سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اگر ہم دین کے سچے وفادار اساتذہ نہیں مہیا کرسکتے تو اپنے طالب علموں کے ذہنوں کو ہم ان اثرات سے پاک وصاف کرنے کی تدابیر اختیار کریں جو مغربی تعلیم کے پروردہ اساتذہ کے درس کے نتیجہ میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اولاً تو ان کے والدین اس خطرہ کو محسوس کریں اور وہ گھر کی تعلیم سے

اس کے تدارک کے لیے بنیادی تعلیم وتربیت کا ایسا نظم کریں، جوان کے بیٹوں کے ذہنوں کی پراگندگی کو پاک وصاف کر سکے پھر اسلامی مفکرین کو چاہئے کہ وہ طلباء کے سرپرستوں کا اس طور پر تعاون کریں کہ ایسی کتابیں تصنیف کریں جو انہیں اسلام مخالف عناصر کے پھیلائے جانے والے فریب سے آگاہ کر سکیں اور اس کا مداوا کر سکیں اور ان کتابوں کے اندر دین کی سچی بات اور حقیقت لکھی جائے۔

علمی تحریر و بحث اور ذہن سازی

ایک بات یہ سمجھنے کی ہے کہ اسلام دشمن عناصر اور ان کے تربیت یافتہ شاگردوں کی جانب سے اسلام کے تشخص اور تاریخ کو داغدار کرنے کا معاملہ زیادہ تر چند مخصوص موضوعات میں ملتا ہے ان میں خاص طور پر تاریخ، سیرت نبوی، تمدنی علوم، نفسیات، ادبیات اور بعض دیگر موضوعات قابلِ ذکر ہیں، ان علوم کے اندر مغربی اور اسلام بیزار فکر اپنے خاص انداز سے اسلامی اور مشرقی تہذیب کی ستھری اور صاف تصویر کو مسخ کر کے پیش کرتی ہے اور مغربی ذہن کے دانشوران موضوعات میں زبان وادب میں اپنی مہارت سے کام لیتے ہیں پہلے تو ہمارے دانشور اور تعلیمی صلاحیت کے لوگوں کی ضرورت ہے اور اس کی روشنی میں مناسب مداوا کرنے کی ضرورت ہے اس کے لیے سب سے زیادہ مناسب اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ مغربی محققین ومفکرین نے اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اور جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں اس کا ایک جائزہ لیا جائے اور قابل گرفت چیزوں پر ان کی گرفت کی جائے اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی جائے، اس سلسلے میں یہ بات جاننے کی ہے کہ مغربی دانشوروں کی اسلامی موضوعات سے تعلق رکھنے والی تصنیفات دو قسم کی ہیں ایک اسلام اور مسلمانوں کی شکل کو مٹانے اور اس کو مسخ کرنے کے موضوع سے متعلق اور دوسری قسم ان کی عربی سے کمزور واقفیت کی وجہ سے کتابوں کے مشکل مقامات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے، چنانچہ اس کا مداوا دونوں طرح سے کرنے کی ضرورت ہے جوان دونوں قسموں کے ردونقد اور وضاحت میں بہت ہی موزوں اور مناسب ہو اسی طرح مختلف ترقی یافتہ زبانوں کے اندر

طاقتور اسلوب میں کتابوں کی تصنیف کی بھی ضرورت ہے جن کے اندر اسلامی تاریخ
اور مذہب اسلام کے حقائق کو بہت ہی پر زور انداز میں اور تسلی بخش طریقہ پر پیش کیا جائے۔

دوسری چیز جس کی جانب خاص توجہ کی ضرورت ہے، نظام تعلیم اور ایسے نصاب سے
متعلق ہے جو اسلامی اخلاق وعقیدہ سے ہم آہنگ نہیں ہے اس لیے یہ نصاب بھی اسلامی اقدار
کو پامال کرنے کا باعث بنتا ہے اور انسان کے دل میں اس کی جگہ دوسرے اقدار وروایات کی
عظمت کو جگہ ملتی ہے، یہ غیروں کی اہمیت کو بڑھانے اور اسلامی زندگی کے ان پہلوؤں کو ماند
کرنے کا اہم ذریعہ ہے، جن کا تعلق ایک مسلمان طالب علم کے معتقدات ومسلمات سے ہوتا
ہے اور مسلمانوں کے لیے کسی بھی طرح اس سے پہلو تہی جائز نہیں ہے، اس چیز کی ذمہ داری
نظام تعلیم تیار کرنے اور نصاب کی کتابیں مرتب کرنے والے افراد پر عائد ہوتی ہے اس خرابی کی
جانب سب سے زیادہ توجہ کے مستحق غیر اسلامی ملکوں میں آباد مسلمان ہیں، ان اسلامی ملکوں
کے لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتے جن میں ابھی اسلام مخالف سازش کے نتیجہ میں ابھی
تک وہاں کا نظام تعلیم ان کے اثرات اور خرابیوں سے پاک نہیں ہوا ہے، اور جہاں ابھی
مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں مکمل آزادی نہیں حاصل ہوسکی ہے۔

لہٰذا ان حالات کے پیش نظر مسلمانوں اور اسلامی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ
وہ اپنے تعلیمی نظام میں جلد تبدیلی کریں اور جلد از جلد اس کو اس نظام سے پاک وصاف کریں
جو ہرگز ہمارے افکار وعقائد سے میل نہیں کھاتا، ان امور میں بہت ہی باریک بینی اور تجربہ
کاری کی ضرورت ہے، اس لیے کہ یہ اغلاط علمی مباحث میں بہت ہی لطیف ہوا کرتے ہیں۔

غیر اسلامی حکومتوں میں اس نظام کو بدلنا آسان نہیں ہے تاہم اتنا ضرور ممکن ہے کہ
اسکول اور کالجز کے اوقات سے الگ کچھ اسباق کا نظم کیا جائے جو ان کے نظام تعلیم سے
علاحدہ ایک دو گھنٹہ انجام دیا جائے، یا پھر وہاں کی تعلیم کو رواج دیا جائے، جو طالب علم اسکول
کے اسباق کو یاد کرنے اور اس کے استحکام کے لیے کرتا ہے، اگرچہ یہ نظام مشکل ہے لیکن
مسئلہ بہت ہی نازک ہے اس سے صرف نظر یا غفلت نئی نسل کے دینی عقائد وافکار کے لیے
بہت مضر اور خطرناک ثابت ہوسکتی ہے اور ایک طرح سے اسے ملی نسلوں کو جسمانی طور پر نہیں

تو عقلی و ذہنی طور پر مفلوج کرنا تو ضرور کہا جائے گا۔

تحقیقی واشاعتی کام

دشمن کے ان حملوں سے حفاظت اور اسلامی فکر کی پختگی کے لیے تحقیق وتالیف اور کتابوں کی بکثرت اشاعت کا اہتمام بھی ضروری ہے، یہ کسی طرح بھی روا نہیں کہ غیروں اور مخالفین کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ اسلامی موضوعات پر اس کے حقیقی مراجع سے مواد اخذ کریں پھر وہ جس طرح چاہیں اس کو بدل کر اور توڑ مروڑ کر اپنے نئے اسلوب وانداز میں خوبصورت گٹ اَپ اور عنوان کے ساتھ پیش کریں اور پھر اسے انہیں اسلام کے نام لیواؤں کو دیں جس کے پڑھنے سے اسلام کی صحیح روح سے متاثر ہو، سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ یورپ اور دیگر ممالک کے کتب خانے بلکہ بہت سے اسلامی ملکوں کے بھی کتب خانے ایسی کتابوں اور لٹریچر سے بھرے پڑے ہیں، یہاں تک کہ ایک مسلمان طالب علم اپنی علمی تشنگی دور کرنے کے لیے ان مراجع کے علاوہ اتنے اچھے انداز میں دوسری کتاب نہیں پاتا۔ چنانچہ ان کتابوں سے غیر شعوری طور پر اس کے اسلامی افکار میں تبدیلی رونما ہوئی، اس طرح ہمارے ہی گھر میں نعوذ باللہ دشمن ہم پر حملہ کر رہا ہے، اس لیے ہم پر کئی پہلوؤں سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے ایک صالح اور پاک وصاف تحقیق کو پیش کرنا، دوسرے فاسد اور پراگندہ اثرات کو زائل کرنا، تاکہ اسلامی معاشرہ پاک وصاف اور صالح معاشرہ بن سکے، اور وہ دوسروں کے لیے آئیڈیل اور ایک بہتر نمونہ ہو، جسے دیکھ کر دوسری قومیں اس کو قبول کرنے پر مجبور ہوں۔

اصل کارساز تو خدا تعالیٰ ہے، اپنی طرف سے کوشش ہو اور خدا پر بھروسہ ہو تو امید ہے کامیابی ضرور ہوگی۔